بنیادی تصوراتِ قرآن

از

مولانا ابوالکلام آزاد

بنیادی تصوراتِ قرآن

از

مولانا ابوالکلام آزاد

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارمینار
حیدرآباد دکن

قیمت .... دو روپے ۵۰ نئے پیسے

بنیادی تصوراتِ قرآن

از

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ کا ملخص

مرتبہ

ڈاکٹر سید عبداللطیف

اکاڈمی اف اسلامک اسٹڈیز

۷۰۴ء آغاپورہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

دو سال قبل اکاڈمی آف اسلامک اسٹڈیز، حیدرآباد نے مولانا ابوالکلام آزاد کی "تفسیرِ سورۂ فاتحہ" کی تلخیص انگریزی زبان میں شائع کی تھی۔ مولانا کی حسبِ خواہش یہ خدمت میں نے انجام دی تھی جیساکہ میں نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ یہ کتاب مولانا کی وفاتِ حسرت آیات (۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء) کے چند ہفتوں پہلے طباعت کے لئے بھیجی گئی اور اس کے دو ماہ بعد شائع ہوئی۔

اس تلخیص کی اشاعت کے بعد اہلِ علم کا اصرار تھا کہ اس کو اردو زبان میں منتقل کیا جائے۔ انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز کے ادارے نے، جس کا وجود مولانا آزاد ہی کی توجہ کا رہینِ منت ہے، یہ مناسب سمجھا کہ اس کو اردو کا جامہ پہناکر اپنے مطبوعات کے سلسلہ میں شائع کردے۔ یہ کام انسٹیٹیوٹ کے ایک رکن مولوی سید اختر حسن ایم۔ اے کے تفویض کیا گیا جو کچھ عرصہ قبل جامعہ عثمانیہ میں فارسی اور اردو کے استاد رہے ہیں۔ چونکہ انگریزی تلخیص مولانا ہی کے الفاظ میں تیار کی گئی تھی، فرق صرف زبان کے لباس کا تھا، مشورہ یہ دیا گیا کہ اس کے اردو ترجمہ کے الفاظ بھی جہانتک ہوسکے مولانا ہی کے الفاظ ہوں جو سورۂ فاتحہ کی

تفسیر میں انھوں نے استعمال کئے ہیں۔ مولوی اختر حسن صاحب اردو کے ایک قابل انشاء پرداز ہیں اور میں یہ کہتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنے اس فریضہ کو خوبی سے انجام دیا۔ جس کا میں شکر گزار ہوں۔

میری تمنا تھی کہ اس ترجمہ کی طباعت و اشاعت سے پہلے میں خود اس کو ایک نظر دیکھ لوں، لیکن جس وقت اس کا مسودہ مجھے ملا میں اپنے آنکھ کے آپریشن کی وجہ سے اس کا مطالعہ نہ کر سکا۔ اس لئے اس کام کو ادارہ کے ایک دوسرے رکن مولوی سید زین العابدین صاحب بیج۔ سی۔ یس وظیفہ یاب ڈسٹرکٹ کلکٹر کے سپرد کیا گیا۔ جس احتیاط سے انھوں نے ترجمہ کا اصل سے مقابلہ کیا اور جس دلچسپی سے انھوں نے اس کی طباعت و اشاعت میں مدد کی اس کے لئے میں ان کا مشکور ہوں

پیشِ نظر تلخیص مولانا کے ان اساسی تصورات کی روح کو اجاگر کرتی ہے جو انھوں نے اسلام کے متعلق اپنی عظیم الشان تصنیف "ترجمان القرآن" میں پیش کئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا کا یہ مہتم بالشان کارنامہ ان کی یاد کو ہمارے قلوب میں ہمیشہ تازہ رکھے گا اور عہدِ حاضر میں قرآنِ حکیم کی تفسیر کی حقیقت میں یہ ایک بہت بڑی خدمت ہے۔

فَصَارَ شِفَاءً لِقَلْبٍ عَلِيلٍ

وَكَانَ ضِيَاءً لِطَرْفٍ كَلِيلٍ

حیدرآباد

یکم مئی سنہ ۱۹۶۰ء

سید عبد اللطیف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

تقریباً انیسویں صدی کے وسط سے علمائے اسلام نے قرآن کو دنیائے جدید کے آگے نئے انداز سے پیش کرنے کی متعدد کوششیں کی ہیں، اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بیشتر حصہ چاہے وہ تفاسیر یا تنقیدی تحقیق کی شکل میں ہو یا مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہونے والے مضامین کی شکل میں، اردو عربی اور انگریزی میں پایا جاتا ہے۔ اظہارِ خیال کے لئے خواہ کوئی زبان استعمال کی گئی ہو۔ بہر صورت ان کوششوں کا ماحصل اطمینان بخش نہیں ہے۔ عصرِ جدید کے ان علما نے زیادہ تر اس بات کی سعی فرمائی ہے کہ قرآنی مطالب کو یوروپی کلچر کے فکری سانچوں میں ڈھال کر پیش کیا جائے جس طرح سے کہ قرونِ اولیٰ کے بعض مفسرین نے یونانی علوم کے عربی ترجموں سے متاثر ہو کر قرآنی مطالب کو یونانی فلسفہ و فکر کا لباس پہنانے کی کوشش کی تھی، البتہ شاذ و نادر ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں اور صرف کہیں کہیں کچھ ایسے گوشے ابھرتے ہیں جہاں قرآنی تعلیمات اپنی حقیقی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہیں غرضکہ ان جدید علماء اور مفسرین نے قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنے کی کوئی مستقل کوشش نہیں کی۔

دورِ جدید کے علماء کی مساعی سے متاثر ہو کر حال حال میں قدامت پسند علماء نے بھی تفہیم قرآن کے تعلق سے بلاشبہ خود کو جدید طرزِ فکر کے حامل ظاہر کرنے کی

کوشش ضرور کی ہے لیکن صدیوں سے مسلمانوں کی مذہبی فکر پر قرون وسطیٰ کی قدامت پسندی کا جو بھاری بوجھ مسلط تھا، اس سے وہ چھٹکارا حاصل نہ کر سکے البتہ ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ اُمید کی ایک کرن دکھائی دی جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد منظرِ عام پر آئی جس کا پہلا حصہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے اور جس میں قرآنی عبارت کو اس کے اصلی معنی میں پیش کرنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا طریقِ اظہار ہے جو نہایت سیدھا سادھا ہے نہ تو اس میں کوئی پیچیدگی پائی جاتی ہے اور نہ کسی قسم کا تصنع۔ وہ انسان کے فطری احساس و فکر اور زندگی کے روزمرہ کے تجربوں کو اپیل کرتا ہے گویا وہ خدا اور بندہ کے درمیان راست بات چیت ہے جو ایسی زبان میں ہے جسے ایک عام آدمی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ قرآن میں وہی اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے جو تمام الہٰی صحائف کا ہے لیکن قرآن کا یہ طریقِ اظہار اپنی اہمیت کے باوجود، عہدِ ماضی میں شاذونادر ہی کسی دارالعلوم یا اسلامی درسگاہ میں مطالعۂ و فکر کا کوئی مستقل موضوع بن سکا حالانکہ خود قرآن نے ان الفاظ میں رہنمائی فرمائی ہے:۔

فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ (۵۰ : ۴۵) قرآن کو قرآنی انداز میں سمجھاؤ۔

لیکن تاریخ کے کسی دور میں بجز صدرِ اول کے اس رہنمائی کو پیش نظر نہیں رکھا گیا قرآن کے ساتھ حزنیہ پیش آیا کہ جوں ہی اس پر ایمان لانے والوں کی پہلی نسل ختم ہوئی بلکہ دوسری صدی ہجری کے اختتام سے قبل ہی یونانی فلسفۂ وعلوم کے

ترجموں کی بدولت مُسلم فکر پر یونانی فکر کا اثر غالب آنے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فہمِ قرآن کے ابتدائی انداز کی سادگی مفقود ہوتی گئی اور اس کی جگہ منطقی دقیقہ سنجیاں راہ پانے لگیں، نوبت یہاں تک پہنچی کہ علمائے اسلام نے قرآن کی ایسی تفاسیر لکھنا شروع کر دیں جن میں قرآن کے الفاظ کو ایسے معنی و مفہوم پہنائے جانے لگے جن کے وہ حامل نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں اِن اُمور کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یاد رہے کہ قرآن کسی مرتبہ منصوبہ کی پیداوار نہیں تھا بلکہ پیغمبر اسلام کی تبلیغی ضرورتوں اور بدلتے ہوئے حالات کے تحت ۲۳ برس کے دوران میں بتدریج نازل ہوا تھا۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے اس کے پیام کو قبول کیا اور اُس کے بتائے ہوئے راستوں پر کامیابی کے ساتھ گامزن ہوئے انہی کے سمجھائے ہوئے مطالبِ قرآن کو فہم قرآنی کا معیار قرار دیا جانا چاہئے تھا لیکن بعد کے مفسرینِ قرآن نے اُن کی تشریحات و تعبیرات کو پسِ پشت ڈال دیا اور قرآن میں نئے نئے معنے پیدا کرنے لگے پھر جیسے جیسے دوسری اقوام کے لوگ اپنے سابقہ عقائد کی یاد کو اپنے ذہنوں میں لئے ہوئے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے اس رجحان میں اضافہ ہی ہوتا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآنی تعلیمات کے تعلق سے طرح طرح کے حیرت انگیز اور اُلجھنیں پیدا کرنے والے نقاطِ نظر فروغ پانے لگے۔ سیدھے سادھے الفاظ کا سیدھا سادھا مفہوم، رفتہ رفتہ مفقود ہونے لگا اور قرآن کا استعاراتی یا تمثیلی عنصر یا تو صرف لفظی مفہوم کا حامل بن کر رہ گیا یا پھر اُسے ایسے معنے پہنا دیئے گئے جو قرآنی تصو

کی حقیقی روح سے یکسر مختلف تھے۔ یہ صورتِ حال جیسا کہ راقم الحروف نے کسی اور جگہ لکھا ہے[1] "کچھ تو اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ خدائے واحد اور اُس کی صفات کے ساتھ تشبّد و تجسّم کے غیر قرآنی تصورات وابستہ کر دیئے گئے تھے اور کچھ اس کا باعث وہ متصوفانہ رجحان تھا جو نئی افلاطونیت کی وجہ سے قرآنی تصوف میں داخل ہو گیا تھا اور بڑی حد تک ایک عجمی یا غیر عربی رجحان تھا جس کی سمت یہ تھی کہ قرآن کی عام فہم عبارت کے بین السطور معنی تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔"

آفت پر آفت یہ ہوئی کہ بیرونی اثرات کے تحت علومِ اسلامیہ کی تاریخ کا جو مجتہدانہ دور اُبھرا تھا، چوتھی صدی ہجری کے بعد وہ بھی ختم ہو گیا اور ہوا کا رخ دوسری طرف ہو گیا۔ اب ردِّ عمل کا دور شروع ہوا اور زندگی اور فکر کے ہر شعبہ میں ہر چیز کے حدود مقرر کر دیئے گئے۔ اس موقع پر ان تمام تبدیلیوں اور ان کی بدولت پیدا ہونے والی طاقتوں کی تاریخ کی تفصیلات بیان کرنا بے محل ہوگا۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ اُس وقت سے جو دور شروع ہوا تھا اس میں اس بات کی بھی اجازت نہیں رہی تھی کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے کوئی نیا راستہ نکالا جائے۔ اس دور میں قرآن کی جو تفاسیر لکھی گئیں وہ یا تو سابقہ تفاسیر کا چربہ ہوتی تھیں یا اُن کی نقل، جیسا کہ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اُس زمانے کی تفاسیر میں بسا اوقات قدیم تفاسیر کے کمزور، بے سر و پا اور بے محل پہلوؤں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس دور میں قرآن کی سادگی

---

[1] "وہ ذہن جس کی تعمیر قرآن کرتا ہے" مطبوعہ اکاڈمی آف اسلامک اسٹڈیز، آغا پورہ حیدرآباد۔ ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵)

اور اس کے راست اندازِ تخاطب کی طرف شاذ و نادر ہی توجہ کی گئی اور یہ سمجھا جانے لگا کہ دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ پُراسرار ہو۔ یہ تھا وہ تصور جس نے قبولِ عام کی سند حاصل کر لی اور قدامت پسند آج تک اسی تصور سے چمٹے ہوئے ہیں۔ رازی اور بیضاوی کی تفاسیر نے جو نمونے قائم کئے۔ تھے آج تک ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی تصانیف خصوصاً سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں، جسے بلاشبہ مطالعہ قرآن کی کلید کہا جا سکتا ہے، ماضی کے اِسی بے ہنگم ورثہ پر ضرب لگائی ہے۔

ہر چند کہ مولانا آزاد کی زندگی کا بہترین حصہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے اگلے محاذ پر صرف ہوا جس میں قید و اسیری کے کئی مرحلے بھی آئے اس کے باوجود یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ انھوں نے ابتلا و آزمائش کی اس یورش میں بھی اپنی طبعی ذہانت و فطانت کے جوہر کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ایسی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جن کی بدولت علومِ اسلامیہ کے شعبہ میں انھیں ایک مسلمہ مرتبہ و وقار حاصل ہو گیا۔ قرآنی تعلیمات کے بارے میں اُن کی تحقیق و کاوش نے اُن پر اُس حقیقی انسانیت دوستی کو منکشف کر دیا تھا جو قرآن کی اساسِ اصلی ہے۔ قرآن کی فیض یافتہ اس انسانیت دوستی کو انھوں نے اپنے اندر کچھ اس طرح جذب کر لیا تھا کہ قرآنی تعلیمات اور اس کی تمام جزئیات کا مطالعہ وہ اُسی کی روشنی میں کرتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم ان کے قرآنی مطالعہ کے علاوہ اُن کے دوسرے مذاکرات و خطبات پر نظر ڈالتے ہیں جو انھوں نے مختلف علمی مجالس میں ارشاد

فرمائے تو ہم یہ پاتے ہیں کہ ان متعدد سیاسی اور ثقافتی مسائل کے بارے میں بھی جن سے آج کی دنیا دوچار ہے وہ اسی انسانیت دوستی میں اُن کا حل تلاش کرتے ہیں۔

مولانا آزاد کے مطالعۂ قرآنی نے متعدد پیرایۂ اظہار اختیار کئے جن میں سب سے زیادہ اہم اُن کا یادگار کارنامہ اُن کی تصنیف 'ترجمان القرآن' ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے اور جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ترجمان القرآن اردو میں قرآن کا توضیحی ترجمہ ہے جس میں متعدد حواشی اور فٹ نوٹ بھی شامل ہیں۔ اس تصنیف کی حقیقی غایت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے آگے قرآنی زبان و الفاظ کے وہی معنی اور مفہوم پیش کئے جائیں جو نزولِ قرآن کے وقت سمجھائے گئے تھے۔ قرآن کے اسلوب و انداز کو آسانی کے ساتھ ذہن نشین کرنے کے لئے انھوں نے ترجمان القرآن کے پہلے حصہ یعنی سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے ضمن میں اُن بنیادی تصورات سے بحث کی ہے جن کو قرآن پیش کرتا ہے اور کسی نہ کسی نہج سے جن کا ذکر پورے قرآن میں بار بار آتا ہے۔

اُن کے اِن مذاکرات میں جو بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے اُس امتیاز کو واضح کیا ہے جو قرآنی تصورات اور اُن کو روبہ عمل لانے کے طریقۂ کار کے درمیان پایا جاتا ہے۔ پہلی چیز کو وہ دین کہتے ہیں اور دوسری چیز کو شرع یا منہاج سے تعبیر کرتے ہیں، خود قرآن میں یہی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ اول الذکر یعنی 'دین' جیسا کہ خود قرآن کا ارشاد ہے خدا کے منتخب بندوں کے ذریعہ جو پیغمبر کہلاتے ہیں، بنی نوع انسان

کی ہر جماعت اور ہر گروہ کو دیا گیا تھا اور اسی بنا پر مولانا آزاد یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہر وہ مذہب جو آج دنیا میں پایا جاتا ہے اولاً اس کی بنیاد وہی دین تھا جس کا ذکر قرآن کرتا ہے گو امتدادِ زمانہ کی بدولت اُس کی شکل بگاڑ دی گئی ہو —— وہ دین جو مختلف پیغمبروں کے ذریعہ بنی نوعِ انسان کو عطا کیا گیا۔ لیکن مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ جہاں تک شرع یا منہاج کا تعلق ہے مختلف زمانوں کے حالاتِ زندگی اور وقت کی ضرورتوں کے لحاظ سے، بنی نوعِ انسان کے مختلف گروہوں میں الگ الگ نوعیت کی حامل رہی لہذا قرآن کا ارشاد ہے کہ جب تک دین کے بنیادی تصور سے کسی شرع و منہاج کا تصادم نہ ہو، اِس تنوع سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ جو چیز بنیادی اہمیت رکھتی ہے وہ دین ہے یعنے خدائے واحد کی ذات پر مضبوط ایمان جس کا اظہارِ عملِ صالح کے ذریعہ اس طرح ہو کہ اُس کی بدولت وحدتِ انسانی قائم ہو سکے۔

مولانا آزاد، بڑے افسوس کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ تصور جس کی غایت بنی نوع انسان کو ایک خاندان کے رشتے میں منسلک رکھنا تھا، انسانی تاریخ کے دور میں، خود غرض عناصر نے اُسے کچھ اس طرح مسخ کر دیا کہ انسان انسان کے درمیان طرح طرح کے اختلافات و نزاعات رونما ہو گئے، اور اُسی کو دین سمجھ لیا گیا۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کا پورا ایک حصہ تصوّرِ الٰہی کے موضوع کے لئے مختص کر دیا ہے جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ کس طرح بہ شمولِ مذہب اسلام ہر مذہب کے پیروؤں نے وحدتِ الٰہی کے بنیادی تصور کو بگاڑ دیا ہے۔ مولانا

آزاد کے افسوس و تاسف کا یہی وہ پہلا تاثر ہے جو ان کے استدلال کا محور ہے اور وہ تمام انسانوں سے یہ دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اصل دین (الدین) کی طرف لوٹ آئیں کیونکہ بنی نوع انسان کے مختلف گروہوں کے درمیان امن و سلامتی اور ہم آہنگی کا یہی ایک واحد راستہ ہے۔

یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ مولانا آزاد کے مطالعۂ اسلام کے نتائج کا پورا سلسلہ اب تک اُس تعلیم یافتہ طبقہ کی دسترس سے باہر ہے جو اردو زبان سے واقف نہیں ہے۔ اگر شروع ہی سے اس بات کی بھی ساتھ ہی ساتھ کوشش کی جاتی ——— اُسی وقت سے جبکہ پہلی مرتبہ ان کا اخبار "الہلال" طلوع ہوا تھا ——— کہ اُن کی قرآنی تحقیقات کے نتائج کو کم از کم انگریزی زبان میں منتقل کیا جاتا جسے اکثر و بیشتر ممالک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جانتے ہیں، تو میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ ایسے اقدام کی بدولت ہر جگہ کے اربابِ فکر و نظر کے لئے "قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تمام مذاہب کے مشترکہ عنصر کو منظرِ عام پر لانے اور مذہبی رواداری اور عالمی اتحاد کے پیدا کرنے کی راہ میں ایک طاقتور محرک بن جاتا۔

اب بھی اس سمت میں پہلا قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔ مولانا آزاد کی تمام تصانیف اور تحریروں میں ترجمان القرآن اُن کا سب سے بڑا اور منفرد کارنامہ ہے اور اس کا ابتدائی باب جو سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے طور پر لکھا گیا ہے، قرآنی مطالعہ کے لئے ایک شاہکار تعارف ہے۔ مولانا آزاد نے اس افتتاحی باب کو اتنی زبردست اہمیت دی ہے کہ اُس تصور کی

تشریح ہیں، جسے سورۂ فاتحہ میں پیش کیا گیا ہے، وہ پورے قرآن کا جائزہ لیتے ہیں۔ قرآن کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والے اس حصہ میں علم و فکر کا ایک ایسا بے پناہ ذخیرہ پائیں گے جو متداول تفاسیر میں کہیں اور نہیں ملے گا۔

راقم الحروف نے ایسے لوگوں کے استفادہ کی خاطر، مولانا آزاد کی ایما، پر سورۂ فاتحہ کی پوری تفسیر کو انگریزی میں منتقل کیا ہے، جسے علیحدہ کتابی شکل میں پیش کیا جائے گا لیکن اُن لوگوں کے لئے جو مذہب کے اس بنیادی تصور کا سرسری طور پر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اس کا ایک تشریحی خلاصہ اِن صفحات پر پیش کیا جا رہا ہے جسے اس تصور کے اہم خد و خال کے لحاظ سے مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

راقم الحروف نے اس موضوع کو اسی انداز سے انگریزی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو مولانا آزاد کا خاص انداز ہے تاکہ انہی کے اندازِ بیان میں اُن کے نقطۂ نظر کا لب لباب، پڑھنے والوں کے سامنے آجائے۔ جب ترجمان القرآن کی تیسری جلد شائع ہو جائے گی اُس وقت اربابِ علم و فضل کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ ہندوستان کے اس عظیم المرتبت علامہ کی زبردست ذہانت و فطانت کا پوری طرح اندازہ لگا سکیں اور اُن خدمات کا اعتراف کر سکیں جو انھوں نے صرف اسلامی علوم ہی کی نہیں بلکہ عالمی فکر و نظر کے لئے بھی انجام دی ہیں۔ بالفعل راقم الحروف کی یہ ناچیز کوشش، ایک

ابتدائی تعارف کا مقصد پورا کر سکتی ہے[1]۔

ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں ایم اے ڈاکٹر فلاسفی (لیپزگ) کیوریٹر اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد کا شکر گذار ہوں کہ موصوف نے ازراہِ کرم اس کتاب (یعنی اصل انگریزی کتاب) کا اشاریہ مرتب کیا اور طباعت کے دوران میں اس کے پروف دیکھے۔

(سید عبد اللطیف)

---

[1] یہ بات قابل اظہار ہے کہ مولانا آزاد نے اس دیباچہ اور اس کتاب کے متن کو ملاحظہ فرمایا اور ملاحظہ کے بعد جس طرح انھوں نے واپس فرمایا، مِن وعَن اسی طرح اس کی طباعت عمل میں آئی ہے۔

سید عبد اللطیف

پہلا باب

قرآن کا تصوّرِ الٰہ

کسی مذہب کے مطالعہ میں سب سے پہلی توجہ طلب بات یہ ہوتی ہے کہ اس کے تصورِ الٰہی کی نوعیت کیا ہے کیونکہ بالآخر مذہب کا یہی پہلو زندگی کو اپنی قدر و قیمت کا معیار عطا کرتا ہے۔

تصوُّرِ الٰہی کی تاریخ ایک بوقلموں تاریخ رہی ہے مادہ کی مماثلت میں کسی شخص کو' تصورِ الٰہی کی تشکیل میں بھی تدریجی ارتقاء کا دھوکا ہو سکتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ خدا کی ہستی کا اعتقاد کسی وقت بھی انسانی ذہن کا کارنامہ نہیں رہا کہ نیچے سے اُوپر کی طرف اُس کی نشوونما کا کھوج لگایا جائے بلکہ یہ اعتقاد فطرتِ انسانی کی خلقت میں شامل ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان نے سب سے پہلے خدا کی جو خیالی تصویر بنائی وہ اُس کی یکتائی یا توحید کی تصویر تھی ــــ ایک ایسی ان دیکھی اور برتر ہستی کی تصویر، جس نے اُن سب چیزوں کو پیدا کیا جنھیں انسان اپنے چاروں طرف دیکھتا یا محسوس کر سکتا تھا ــــ اور پھر آہستہ آہستہ یہ تصویر بدلتی گئی اور اس میں ایک طرح کا انحطاط پیدا ہوتا گیا یہاں تک کہ توحیدِ الٰہی کی جگہ اشراک اور تعددِ الٰہ

کا تصوّر اُبھرنے لگا یعنے دوسرے الفاظ میں انسان کی دینیاتی تاریخ میں ارتقاء کے بجائے ارتجاع کا عمل کار فرما نظر آتا ہے۔ البتہ جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے ارتقاء کے نظریہ سے تحقیق و جستجو کے میدان میں گراں قدر مدد مل سکتی ہے۔

علمائے یورپ کا یہ رجحان کہ عقیدۂ توحید کو تدریجی ارتقاء کا نتیجہ قرار دیا جائے، اٹھارویں صدی کے اواخر میں نمایاں ہوا لیکن اس خیال پر مبنی بیشتر نظریئے انیسویں صدی کے نصف آخر میں مُدوّن ہوئے اور نوامیسِ فطرت، بے جان اشیاء کی پرستش، اجداد پرستی، خرافاتی اساطیر، اجرام سماوی کی پُوجا اور جادو ٹونوں وغیرہ کے عقیدہ میں خدا پرستی کی ابتدا کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ اِن مختلف نظریات نے جس خیال کو پروان چڑھایا وہ یہ تھا کہ زندگی کے دوسرے مظاہر کی طرح توحیدِ الٰہی کا تصوّر بھی ایک تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔

لیکن بیسویں صدی کے انقلاب انگیز انکشافات نے اس خیال کو متزلزل کر کے رکھدیا۔ جنوب مشرقی آسٹریلیا اور بحیرۂ کاہل کے جزائر میں بسنے والے وحشی قبائل اور پھر شمالی امریکہ کے اُن قدیم قبائل کے بارے میں ــــــ جو عہد عتیق سے آج تک زندگی کے ایسے قدیم ترین طریقوں پر کاربند ہیں جن کے تہذیبی دامن میں ارتقائی تُرقی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا ــــــ جب تحقیقی کام ہوا اور پھر مصریات کی تحقیقات اور عراق اور مہنجو دارو کی کھدائیوں کے آثار سامنے آئے تو یہ حقیقت برملا ہو گئی

کہ انسان کا توحیدی اعتقاد کسی ارتقائی سلسلہ کی کڑی نہیں ہے چنانچہ جدید سامی اثریات کے مطالعہ سے بھی اس نقطۂ نظر کی تصدیق ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ تمام سامی قبائل اپنے ابتدائی دور میں ایک اَن دیکھے خدائے برتر کا اعتقاد رکھتے تھے۔ پہلی جنگ عالمگیر کے بعد سرحدِ حجاز کی وادی عقبہ اور شمالی شام کے راس شمرہ میں جو آثار دریافت ہوئے اُن سے اس تاریخی حقیقت کو اور زیادہ استحکام حاصل ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بیسویں صدی کی علمی تحقیق و تلاش نے اِس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ سب سے پہلے انسان کے دل میں جو عقیدہ پیدا ہوا وہ توحیدِ الٰہی کا عقیدہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان نے پہلی مرتبہ اس دنیا میں اپنی آنکھ کھولی تو وہ اپنی فطرت اور اس ماحول کے تحت جس میں اُس نے اپنے آپ کو گھرا ہوا پایا وہ ایک یگانہ ہستی کے اعتقاد پر مجبور ہو گیا جو اُن تمام چیزوں کی پیدا کرنے والی تھی جنھیں وہ اپنے اِردگرد دیکھ رہا تھا پھر آگے چل کر آہستہ آہستہ اُس نے اُن تمام صفات اور خصوصیات کو بھی اس ہستئ مطلق کی ذات سے وابستہ کرنا شروع کر دیا جو خود اُس کی اپنی صفات و خصوصیات سے مماثلت رکھتی تھیں اور اس طرح اس کے ابتدائی عقیدۂ توحید میں ایک ترجیعی شکل پیدا ہونے لگی۔ مولانا آزاد کے الفاظ میں "آدم نے آنکھیں روشنی میں کھولی تھیں پھر آہستہ آہستہ تاریکی پھیلنے لگی" چنانچہ مصر یونان، کالڈیا، ہندوستان، چین اور ایران اِن سب ملکوں کی روایتوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں نوعِ انسانی فطری ہدایت کی زندگی

بسر کرتی تھی۔ انجیل نے قطعی انداز میں آدم کے وجود کو ایک بہشتی وجود قرار دیا ہے پھر جب اس کے قدموں میں لغزش آئی تب ہی وہ اس بہشتی زندگی سے بھی محروم کر دیا گیا۔ روشنی کا جلوہ پہلے نمودار ہوتا ہے تاریکی بعد میں آتی ہے۔ قرآن کا اعلان بھی یہی ہے:۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا :۔ (۱۰ : ۱۹)

"ابتداء میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے (یعنی الگ الگ راہوں میں بھٹکے ہوئے نہ تھے) پھر اختلاف میں پڑ گئے۔"

وَكَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (۲ : ۲۱۳)

ابتداء میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا (یعنی فطری ہدایت کی ایک ہی راہ پر تھے پھر اس کے بعد اختلافات پیدا ہو گئے) پس اللہ نے ایک کے بعد ایک نبی مبعوث کئے۔ وہ نیک عملی کے نتیجوں کی خوشخبری دیتے تھے۔ بد عملی کے نتیجوں سے متنبہ کرتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ نوشتے نازل کئے تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے ہیں ان کا فیصلہ کر دیں۔"

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ جہاں تک مذاہب کی اختلافی راہوں کا تعلق ہے ان کا تعلق وجودِ الٰہی سے نہیں ہے بلکہ یہ اختلافات زیادہ تر صفاتِ الٰہی کے بارے میں پائے جاتے ہیں۔ انسانی عقل محسوسات کے دائرہ میں محدود ہے، عموماً اس کا تصور اس دائرہ سے باہر قدم نہیں نکالتا اسی لئے عقلِ انسانی

ذاتِ مطلق کے تصور کا بہ آسانی احاطہ نہیں کر سکتی، جب کبھی وہ کسی ان دیکھی چیز کے تصور کی سعی کرے گی تو ناگزیر ہے کہ تصور میں وہی صفات آجائیں جن کا ادراک اُسے خود اپنی ذات میں ہوتا ہے۔ اس لئے صفاتِ الٰہی کی جو تصویر اُس کے ذہن میں پیدا ہوتی تھی لازمی طور پر اس میں بھی اس کی ذہنی طفولیت کا رنگ پایا جاتا تھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ، جوں جوں اس کا ذہن ترقی کرتا گیا اُسی کے مطابق اس کا تصورِ الٰہی بھی بدلتا گیا یہاں تک کہ جتنی اعلیٰ صفات اُس کی ذات میں پیدا ہوتی گئیں وہ اپنے معبود کی صفات کو بھی اُن کے مطابق بلند کرتا گیا۔ اسی نقطۂ نظر سے خدائی صفات کے بارے میں انسانی تصورات کی ارتقائی رفتار کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد نے اس ارتقائی سلسلہ کی تین نمایاں کڑیوں کا ذکر کیا ہے جو ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں، یعنی تجسّم و تشبیہ سے تنزیہ کی طرف، پھر تعدّد و اشراک سے توحید کی طرف اور صفاتِ قہر و جلال سے صفاتِ رحمت و جمال کی طرف۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے متعلق انسان کا ابتدائی تصوّر، صفاتِ قہریہ کے تصور سے کیوں شروع ہوا؟ اس کی علّت واضح ہے۔ فطرتِ کائنات کا تعمیری حسن تخریب کی نقاب میں پوشیدہ ہے، انسانی فکر اپنے عہدِ طفولیت میں تعمیر کا پوشیدہ حسن نہ دیکھ سکی، وہ تخریب کی ہولناکیوں سے سہم گئی۔ تعمیر کا حسن و جمال دیکھنے کے لئے فہم و بصیرت کی نگاہ مطلوب تھی جو وقت کی رفتار کے ساتھ تدریجی طور پر انسان کو حاصل ہوئی

یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلے جب عقل انسانی نے صفاتِ الٰہی کی صورت آرائی کرنی چاہی تو فطرتِ کائنات کے سلبی مظاہر کی دہشت سے وہ فوراً متاثر ہوگئی اور ایجابی اور تعمیری حقیقت سے اثر پذیری میں اسے بہت دیر لگی۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آتش فشاں پہاڑوں کا انفجار، زمین کا زلزلہ، آسمان کی ژالہ باری، دریا کا سیلاب، سمندر کا تلاطم، اِن تمام سلبی مظاہر نے اُس میں دہشت و ہیبت پیدا کی اور وہ اپنے خدا کو ایک غضبناک خدا کی ڈراؤنی صورت میں دیکھنے لگا، بادل اور بجلی کی خوفناک گرج اور کڑک میں یا آتش فشاں پہاڑوں کے بہتے ہوئے لاوے میں وہ حُسن و محبوبی کے خدا کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

خود اس کی ابتدائی معیشت کی نوعیت بھی ایسی نہ تھی جو اُس کے خوف و دہشت کے جذبات کو کچل سکتی۔ وہ اپنے آپ کو کمزور اور غیر محفوظ محسوس کرتا تھا اور اپنے علاوہ ہر شے اُسے دشمنی اور ہلاکت پر تُلی نظر آتی تھی، مچھروں کے جُھنڈ چاروں طرف منڈلا رہے تھے، زہریلے جانور ہر طرف رینگ رہے تھے اور درندوں کے حملوں سے اُسے ہر وقت مقابل رہنا پڑتا تھا، سر پر سورج کی تپش بے پناہ تھی اور سال بھر کے بدلتے ہوئے موسم اُسے اپنی عافیت کے دشمن نظر آتے تھے۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز اُس کی تباہی و بربادی کے درپے ہے اس ماحول کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اُس نے اپنے خدا کا جو تصور قائم کیا وہ ایک خوف و دہشت کے خدا کا تصوّر تھا لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا تدریجی طور پر اس کی ذات میں اور اُس کے ماحول

میں بھی تبدیلی آتی گئی اور اس کے تصور میں یاس و دہشت کے پہلو بہ پہلو امید و رحمت کا عنصر شامل ہوتا گیا یہاں تک کہ معبودیت کے تصور میں صفاتِ رحمت و جمال نے بھی ویسی ہی جگہ پالی جیسی صفاتِ قہر و جلال کے لئے تھی۔ اس نئی بیداری نے قہر و ہلاکت کی قوتوں کے ساتھ لطف و رحمت کی ان قوتوں کا تصور بھی پیدا کر دیا جو رزق، دولت، حسن اور علم کا مظہر تھیں، یونان کا علم الاصنام اپنی لطافتِ تخیل کے لحاظ سے بلاشبہ اپنی خاص جگہ رکھتا ہے لیکن اس کی پرستش کے قدیم معبود بھی قہر و غضب کی خوفناک قوتیں تھیں، ہندوستان میں آج تک رحمت و بخشش کے دیوتاؤں سے کہیں زیادہ ہلاکت و تباہی کے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے۔

نزولِ قرآن سے قبل تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہنِ انسانی متحمل ہو سکا تھا، یہ تھا کہ کسی تشبیہی سہارے کے بغیر خدا کا تصور کیا جائے لیکن جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے وہ جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کی تمثیل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا یہاں تک کہ یہودی تصور بھی جس نے اصنام پرستی کی کسی شکل کو جائز نہیں رکھا تھا اس قسم کے تشبیہہ و تمثیل سے بے نیاز نہ رہ سکا۔ اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فکرِ انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ تمثیل و تشبیہہ کا پردہ ہٹا کر صفاتِ الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتی[1]۔ حضرت مسیح نے بھی جب چاہا کہ رحمتِ الٰہی کا عالمگیر تصور پیدا کریں

---

[1] طلوعِ اسلام کے وقت مختلف مذاہبِ عالم میں صفاتِ الٰہی کے جو تصورات تھے، اس موقع پر مولانا آزاد نے اپنی تصنیف میں تفصیل کے ساتھ ان پر روشنی ڈالی ہے۔
دیکھئے صفحات ۱۳۵ تا ۱۶۵ ترجمان القرآن جلد اول دوسرا ایڈیشن لاہور ۱۹۴۷ء

توانھوں نے بھی باپ اور بیٹے کے رشتہ کی تشبیہہ سے کام لیا۔ اسی تشبیہہ کی بدولت ظاہر پرستوں نے ٹھوکر کھائی اور مسیح علیہ السلام کی دی ہوئی مثال اور مقصد کو نہ سمجھنے کے باعث ان کے پیروؤں نے خود مسیح کو خدا کا بیٹا بنا دیا بلکہ خدا کا مرتبہ عطا کر دیا۔

قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ خدا کے تصور کی راہ سے وہ تمثیل و تشبیہہ کے تمام پردے اٹھا دیتا ہے اور خدا اور اس کی صفات کا جلوہ اس طرح سامنے آجاتا ہے کہ اس میں تجسّم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۱ : ۱۹)	اُس کے مثل کوئی شئے نہیں (کسی چیز سے بھی تم اُسے مشابہ نہیں ٹھہرا سکتے)
لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۶ : ۱۳۰)	انسان کی نگاہیں اُسے نہیں پا سکتیں لیکن وہ انسان کی نگاہوں کو دیکھ رہا ہے۔ اللہ کی ذات یگانہ ہے، بے نیاز ہے اُسے کسی کی احتیاج نہیں
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (۱۱۲ - ۱ - ۴)	اللہ کی ذات یگانہ ہے، بے نیاز ہے، اُسے کسی کی احتیاج نہیں نہ تو اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی ہستی اس کے درجے اور برابری کی ہے۔

نزولِ قرآن سے قبل جلوۂ حقیقت کی جھلک دیکھنے کے لئے دو راستے اختیار کئے جاتے تھے۔ ایک ذاتِ مطلق سے صفات کو وابستہ کرنے کا راستہ تھا اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ خدا کو تمام صفات سے پاک و بلند رکھا جائے

پہلا راستہ تشبیہ کی طرف لے گیا جس کی وجہ سے عرفانِ حقیقت میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ دوسرا طریقہ وہ تھا جس کا خاص طور سے اوپانی شدوں نے تتبع کیا یہ ——'نیتی' نیتی'—— کا ایک منفی تصور تھا بلا شبہ یہ تصور تنزیہہ یا نفیٔ صفات کا ایک انتہائی جلوہ دکھاتا ہے لیکن عملاً وہ نفی کی طرف لیجاتا ہے اور ہمیں یقین محکم کی لذت سے محروم کر دیتا ہے، ایسا تصور زیادہ سے زیادہ ایک فلسفیانہ تخیل پیدا کر سکتا ہے لیکن ایک زندہ اور راسخ عقیدہ نہیں بن سکتا۔ چنانچہ نفیِ صفات کے تصور کو اُس کی منطقی انتہا یعنے تعطیل سے بچانے کے لئے 'ذاتِ مطلق' 'برہماں' کو ذاتِ مشخص 'ایشور' میں اُتارے بغیر کام نہ چل سکا۔ بہر حال (قرآن سے پہلے) اِن دو راہوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ناگزیر تھا۔ قرآن نے افراط اور تفریط کے اِن دونوں راستوں سے احتراز کیا اور اپنی ایک الگ راہ نکالی۔ قرآن نے جو راستہ اختیار کیا وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اس کے درجۂ کمال پر پہنچا دیتا ہے دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچا لے جاتا ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی ہر صفت کو تشبیہہ کے اثر سے بھی بچا لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے 'خدا زندہ ہے' قدرت والا ہے' پیدا کرنے والا ہے' رحمت والا ہے' سب کچھ دیکھنے سُننے اور جاننے والا ہے وغیرہ وغیرہ اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ قرآن بلا تامل جگہ جگہ گوناں گوں تمثیلات کا استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس بات کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ خدا کے مشابہ کوئی چیز نہیں جو تصور میں آسکے۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے

زندہ رہنے کی طرح نہیں ہے، اس کا دیکھنا، سُننا اور جاننا ویسا نہیں ہے جس طرح کہ ہم دیکھتے، سنتے اور جانتے ہیں، اس کی قدرت و بخشش کی تعبیر کے لئے ہاتھ کی تشبیہہ اور اس کے جلال اور ہر چیز پر محیط ہونے کی تمثیل کے واسطے عرش کا استعارہ ضرور ہے لیکن اس کا مطلب وہ نہیں ہو سکتا جو افعالِ انسانی کے تعلق سے ان الفاظ سے ہمارے ذہن میں متشکل ہونے لگتا ہے۔

قرآن کے تصورِ الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے۔ ایک طرف بامِ حقیقت کی وہ بلندی کہ انسانی ذہن و فکر اس بلندی تک پہنچنے سے عاجز اور دوسری طرف انسانی فطرت کا اضطرابِ طلب اور ذوقِ دید اتنا شدید کہ جلوۂ حقیقت دیکھے بغیر چین نہیں پڑھتا۔ اگر تنزیہہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں جا گرتے ہیں اور اگر اثباتِ صفات کی صورت آرائیوں میں دُور نکل جاتے ہیں تو تشبُّہہ اور تجسُّم میں کھو جاتے ہیں۔ پس قرآن نے جو راستہ بتایا ہے وہ ایسا راستہ ہے کہ نہ تو اثباتِ صفات کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پاتا ہے اور نہ تنزیہہ کی باگ ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اس لئے قرآن کا تصورِ الٰہی آریائی فلسفہ کے تصورِ الٰہی سے ممتاز ہے، آریائی حکمت نے تلاشِ حقیقت کی سرگرمی میں خود ذاتِ الٰہی کو مشخص کر دیا اور اس طرح مورتی پوجا کے دروازے کھول دئے۔ قرآن نے اسے صرف صفاتِ الٰہی کے تشخص سے پورا کر دیا، خدا کے وجود کو مشخص نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تشبُّہہ و تجسُّم

کے لئے کوئی امکان باقی نہ رہا۔

خدا کی توحید کا قرآنی تصور ایک محکم تصور ہے، وہ ایجابی اور سلبی دونوں پہلو رکھتا ہے۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک اور بس ایک ہے اور سلبی پہلو یہ ہے کہ اُس کے مانند کوئی نہیں اور جب اس کے مانند کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفات بھی اس کے لئے مختص کی جائیں اُن میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ پہلی بات کو توحید فی الذات سے اور دوسری کو توحید فی الصفات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کے اس تصور سے قبل توحید کے ایجابی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا تھا لیکن اس کا سلبی پہلو نمایاں نہ ہو سکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے پہلے کے تمام مذاہب میں اگرچہ عقیدۂ توحید کی تعلیم موجود تھی لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی اور اصنام پرستی نمودار ہوتی رہی۔

ہندوستان میں تو غالباً روزِ اوّل سے ہی یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لئے دیوتاؤں اور انسانی عظمتوں کی پرستاری ناگزیر ہے اور خدائے واحد کی پرستش صرف خواص کا حصہ قرار دی گئی تھی۔ فلاسفۂ یونان کا بھی یہی خیال تھا، وہ یقیناً اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہِ اولمپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ عوام کے اصنامی عقائد میں خلل انداز ہو۔ انھیں اندیشہ یہ تھا کہ اگر دیوتاؤں کی پرستش کا نظام قائم نہ رہا تو عوام کی سماجی و مذہبی زندگی درہم و برہم ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں، کسی بانیٔ مذہب کو جو مرتبہ عطا کیا جاتا تھا وہ بطورِ خاص قابلِ غور ہے۔ یہ درست ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ معلم کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان پیدا نہ ہو جائے لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ اسی مقام پر پہنچکر بہتوں نے ٹھوکر کھائی، کیونکہ وہ اس کی ٹھیک ٹھیک حد بندی نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی مذہب یا فلسفہ کے معلّم کی شخصیت کو کبھی خدا کا اوتار بنا دیا گیا تو کبھی ابن اللہ سمجھ لیا گیا اور یہ نہ ہوا تو اُس کی تعظیم میں خدا کی تعظیم و بندگی کی سی شان پیدا کر دی گئی۔ مثلاً یہودیوں نے بلاشبہ ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بتوں کی پُوجا کی ہو تاہم انھوں نے بھی اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انھیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دی گوتم بدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اس کی تعلیم میں اصنام پرستی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اُس کی آخری نصیحت جو ہم تک پہنچی ہے یہ ہے کہ — "ایسا نہ کرنا کہ میری نعش کی راکھ کو پوجنا شروع کر دو، اگر تم نے ایسا کیا تو یقین جانو نجات کی راہ تم پر بند ہو جائے گی"۔ لیکن ان کے پیروؤں نے اس وصیت پر جیسا کچھ عمل کیا ہمارے سامنے ہے، نہ صرف یہ کہ بدھ کی خاک اور یادگاروں پر انھوں نے مُعبد تعمیر کئے بلکہ بُدھ مت کی اشاعت کا ذریعہ ہی یہ سمجھا گیا کہ بدھا کے مُجسموں سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی ذات یا معبود کے آج اتنے مجسمے نہیں ہیں جتنے کہ گوتم بُدھ کے ہیں۔ اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیت کی اصلی

تعلیم سرتاسر توحید کی تعلیم تھی لیکن ابھی اُس کے ظہور پر پورے سَو برس بھی نہیں گذرے تھے کہ الُوہیتِ مسیح کا عقیدہ نشوونما پا چکا تھا اس کے برعکس قرآن نے توحید فی الصفات اور توحید فی الذات کا ایک ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ شرک اور اس کے مماثل دوسری لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے اور خدا کے تصور کے بارے میں یہی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر طرح کی عبادت و نیاز کی مستحق صرف خدا کی ذات ہے پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے آگے سر جھکایا تو، توحیدِ الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ قرآن کہتا ہے یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی ہے اور اُن کی دعائیں قبول کرتی ہے پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی اس کا شریک بنالیا تو گویا اُسے تم نے خدا کی خدائی میں شریک ٹھیرالیا اور تمہارا عقیدۂ توحید درہم و برہم ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تلقین کی گئی ہے اور پُورا زور 'اِيَّاكَ' پر ہے' تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور ردّ اشراک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورۃ بلکہ کوئی صفحہ اُس سے خالی ہو۔

اور یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم قرآن میں پیغمبر اسلام کو جو مرتبہ دیا گیا ہے اُس پر نظر ڈالتے ہیں۔ قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام ایک بشر اور خدا کے بندے ہیں۔ اسلام نے اپنی

تعلیم کا بنیادی کلمہ ہی یہ قرار دیا ہے کہ:۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ	یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا
وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ	کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ
وَرَسُوْلُهٗ	محمد (صلعم) خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے

اس قرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے ٹھیک اُسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہئے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لئے کہ اس بات کا کوئی موقع ہی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرے۔

یہی وجہ تھی کہ پیغمبر (صلعم) کی وفات کے بعد اگرچہ مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے لیکن پیغمبر (صلعم) کی شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی نزاعی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی آپ کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گذرے تھے کہ پیغمبرؐ کے خسر اور اسلام کے خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے بہ سرِ منبر اعلان کر دیا کہ:۔

"جو کوئی تم میں محمد (صلعم) کی پرستش کرتا تھا سو اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمدؐ نے وفات پائی اور جو کوئی تم میں اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اس کے لئے موت نہیں۔"

قرآن سے پہلے مذہبی عقائد کی تعلیم میں بھی خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں خداشناسی کے تین درجے قرار دیے گئے تھے، عوام کے لئے دیوتاؤں کی پرستش، خواص کے لئے براہِ راست خدا کی پرستش اور اخصّ الخواص کے لئے وحدت الوجود کا مشاہدہ۔ یہی حال فلاسفۂ یونان کا تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسّم خدا کا تصور صرف اہلِ علم و حکمت ہی کر سکتے ہیں۔ عوام کے لئے اسی میں امن ہے کہ دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں لیکن قرآن نے اس امتیاز کو یک قلم مسترد کر دیا، اس نے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی، اور سب کے لئے صفاتِ الٰہی کا ایک ہی تصور پیش کیا۔ وہ حکما اور عُرفَا سے لے کر ایک چرواہے اور دہقان تک سب کو حقیقت کا ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے اور سب پر اعتقاد و ایمان کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے۔

اس سلسلہ میں معاملہ کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے، ہندوستان میں خواص و عوام کے خدا پرستانہ تصورات کے درمیان جو فرقِ مراتب ملحوظ رکھا گیا ہے وہ معاملہ کو اس رنگ میں بھی نمایاں کرتا ہے کہ یہاں کا مذہبی نقطۂ خیال ابتدا سے فکر و عمل کی رواداری پر مبنی رہا ہے گویا ہر مذہبی عقیدے اور عمل کے لئے گنجائش نکالی گئی اور ہر فکر کو آزادانہ نشو و نما کا موقع دیا گیا۔ مذہبی اختلافات جو دوسری قوموں میں باہمی جنگ و جدال کا باعث رہے یہاں آپس کے سمجھوتوں کا ذریعہ بنے۔ تفاہم اور تطابق گویا یہاں کے ذہنی مزاج کی ایک عام خصوصیت تھی

ایک ویدانتی جانتا ہے کہ اصل حقیقت اشراک اور بُت پرستی کے عقائد سے بالاتر ہے تاہم وہ بُت پرستی کا مخالف اور منکر نہیں ہو جاتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے راستے کی یہ پہلی منزل ہے اور راہرو چاہے کوئی راستہ اختیار کرے مگر مقصودِ اصلی ہر حال میں سب کا ایک ہی ہے۔

بلاشبہ فکر و عمل کی اس رواداری سوچ کا، جو ہندوستان کی تاریخ میں برابر اُبھرتی رہی ہے، ہمیں اعتراف کرنا چاہیے لیکن زندگی، عمل اور ردِّعمل کا مظہر ہوتی ہے اور اگر ہم اس راہ میں حد بندی کے خطوط قائم نہ کریں تو علم و اخلاق کے تمام احکام درہم و برہم ہو جائیں گے اور اخلاقی اقدار کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہ رہے گی۔ رواداری یقیناً ایک خوبی کی بات ہے لیکن ساتھ ہی عقیدہ کی مضبوطی، رائے کی پختگی اور فکر کی استقامت بھی زندگی کے ایسے پہلو ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا پس یہاں کوئی نہ کوئی حدِ فاصل ضرور ہونی چاہیے جو ان تمام خوبیوں کو اپنی اپنی جگہ پر قائم رکھے ورنہ اخلاق کے تمام احکام کو مناسب طور پر روبہ عمل نہیں لایا جا سکتا، جوں ہی یہ خطوط کمزور ہو جاتے ہیں اور ہلنے لگتے ہیں اخلاق کی پوری دیوار ہل جاتی ہے مثلاً عفو و درگذر بڑی ہی حسن و خوبی کی بات ہے لیکن یہی عفو و درگذر جب اپنی جائز حدود سے آگے نکل جاتا ہے تو عفو و درگذر نہیں رہتا بلکہ بزدلی اور بے ہمتی قرار پاتا ہے۔ شجاعت انسانی سیرت کا سب سے بڑا وصف ہے۔ لیکن یہی وصف جب اپنی حد سے گذر جائے گا تو ظلم و تشدد بن جائے گا۔

دو حالتیں ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ ایک حالت یہ ہے کہ کسی خاص اعتقاد اور عمل کی روشنی ہمارے سامنے آگئی ہے اور ہم اس کے بارے میں ایک خاص نتیجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی نسبت ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے۔ ہم اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں یا متزلزل ہو جائیں۔ دوسری حالت یہ ہے کہ جس طرح ہم کسی خاص نتیجہ تک پہنچتے ہیں اسی طرح دوسرے لوگ بھی بعض خاص نتیجوں تک پہنچ گئے ہیں، اب ان کی نسبت ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟ ہماری طرح انھیں بھی اپنی راہ پر چلنے کا حق ہے یا نہیں؟ رواداری یہ ہے کہ اپنے حق و اعتقاد و عمل کے ساتھ دوسروں کے حق اعتقاد و عمل کا بھی اعتراف کیجئے اور اگر اُن کا راستہ آپ کو صریحاً غلط دکھائی دے رہا ہے تب بھی ان کے اس راستے پر چلنے کے حق سے انکار نہ کیجئے، لیکن رواداری کی حدود کو اگر یہاں تک بڑھا دیا جائے کہ وہ آپ کے عقیدوں میں بھی مداخلت کرنے لگے اور آپ کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہونے لگے تو پھر یہ رواداری نہ ہوئی۔

مفاہمت زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے، ہماری زندگی بجائے خود سر تا سر مفاہمت ہے۔ لیکن اس کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے تاکہ آپ اپنے عقیدہ کو محفوظ رکھ سکیں تا وقتیکہ اس میں تبدیلی کے لئے کوئی اندرونی روشنی آپ کے سامنے نہ آئے آپ مجبور رہیں کہ آپ اس پر جمے رہیں اور اُس پر قائم رہنے کا آپ کو حق ہے۔ آپ دوسروں کے عقائد کا احترام ضرور کرینگے

لیکن اپنے حق پر بھی آپ مُصر رہیں گے اور اپنے عقیدہ کو کمزوری کے حوالے نہ ہونے دیں گے۔ اِن دو حالتوں میں فرق و امتیاز کی وجہ سے اعتقاد و عمل کی دنیا میں کتنی ہی مصیبتیں نازل ہوئیں۔ اگر اعتقاد کی مضبوطی آئی تو اتنی دور تک چلی گئی کہ رواداری کے تمام تقاضے بھلا دئے گئے اور دوسروں کے اعتقاد و عمل میں جبراً مداخلت کی جانے لگی۔ بعض اوقات رواداری کو اتنا آگے بڑھا دیا گیا کہ استقامتِ فکر ورائے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ پہلی بے اعتدالی کی مثالیں ہمیں مذہبی تنگ نظریوں اور سخت گیریوں کی تاریخ میں ملتی ہیں اور دوسری بے اعتدالی کی مثال ہندوستان کی تاریخ مہیا کر دیتی ہے۔ یہاں فکر و عقیدہ کی کوئی بلندی بھی وہم و جہالت کی گراوٹ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی اور علم وعقل اور وہم و جہل میں ہمیشہ سمجھوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان سمجھوتوں نے ہندوستانی دل و دماغ کی شکل وصورت بگاڑ دی اور اُس کی فکری ترقی کا تمام حُسن اصنامی عقیدوں اور وہم پرستیوں کے گرد و غبار میں چھپ گیا، ہندوستان کے عصری مؤرخوں نے اس صورتِ حال کا اعتراف کیا ہے۔ ہمارے عہد کے ایک لائق ہندو مصنف ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس دور کی فکری حالت پر نظر ڈالتے ہوئے جبکہ آریائی تصورات ہندوستان کے مقامی مذاہب سے مخلوط ہونے لگے تھے، تسلیم کیا ہے کہ:۔

"ہندو مذہب کی مخلوط نوعیت کی توضیح ہمیں اس صورت حال میں مل جاتی ہے۔ صحرانورد قبائل کے وحشیانہ توہمات

سے لے کر اونچے سے اونچے درجہ کے تہہ اس غور و خوض تک ہر درجہ اور ہر دائرۂ فکر کے خیالات یہاں باہمد گر ملتے اور مخلوط ہوتے رہے۔ آریائی مذہب اول روز سے کشادہ دل خود رو اور روادار تھا، وہ جب کبھی کسی نئے مؤثر سے دوچار ہوا تو خود سمٹتا گیا اور جگہیں نکالتا گیا، اس کی اس مزاجی حالت میں ہم ایک سچے انکسارِ طبع اور ہمدردانہ مفاہمت کا شائستہ رجحان محسوس کرتے ہیں۔ ہندو دماغ اس کے لئے تیار نہیں ہوا کہ نچلے درجہ کے مذہبوں کو نظر انداز کر دے یا لڑ کر ان کی ہستی مٹا دے۔ اس کے اندر ایک مذہبی مجنون کا غرور نہیں تھا کہ صرف اسی کا مذہب سچا مذہب ہے۔ اگر انسانوں کے ایک گروہ کو کسی ایک معبود کی پرستش، اس کے طور طریقے پر تسکینِ قلب مہیا کر دیتی ہے۔ تو تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ بھی سچائی کی ایک راہ ہے مکمل سچائی پر کوئی یہ یکدفعہ قابض نہیں ہو جا سکتا۔ وہ صرف بتدریج اور بہ تفریق ہی حاصل کی جا سکتی ہے اور یہاں ابتدائی اور عارضی درجوں کو بھی اُن کی ایک جگہ دینی پڑتی ہے۔ ہندو دماغ نے رواداری اور باہمی مفاہمت کی یہ راہ اختیار کر لی لیکن وہ یہ بات بھول گیا کہ بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جب رواداری کی جگہ ناروا داری ایک فضیلت کا حکم پیدا کر لیتی ہے اور مذہبی معاملات میں بھی گریشم کے قانون کی طرح کا ایک قانون کام کرتا

رہتا ہے۔ جب آریائی اور غیر آریائی مذاہب باہمدگر ملے، ایک شائستہ اور دوسرا ناشائستہ، ایک اچھی قسم کا، دوسرا نکما تو غیر شائستہ اور نکمے اجزا میں قدرتی طور پر یہ میلان پیدا ہو گیا کہ شائستہ اور اچھے اجزا کو دبا کر معطل کر دے۔[1]"

قرآن کے تصورِ الٰہی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کسی طرح کی اعتقادی مفاہمت کو جائز نہیں رکھا، وہ خدا کے توحیدی اور تنزیہی تصور میں سر تا سر بے میل اور بے لچک رہا تاہم وہ کسی عنوان بھی دوسرے عقائد کے بارے میں "روادارانہ طرزِ عمل" سے ہمیں روکتا نہیں البتہ اعتقادی مفاہمتوں کے تمام دروازے بند کر دئے گئے ہیں۔

قرآن نے تصورِ الٰہی کی بنیاد انسان کے عالمگیر وجدانی احساس پر رکھی ہے، یہ نہیں کیا ہے کہ اُسے نظر و فکر کی کاوشوں کا ایک ایسا معمہ بنا دیا ہو جسے خاص طبقہ کا ذہن ہی حل کر سکے۔ زندگی کے بارے میں انسان کا عالمگیر وجدانی احساس کیا ہے؟ یہ ہے کہ کائناتِ ہستی خود بخود پیدا نہیں ہو گئی۔ پیدا کی گئی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ایک صانع ہستی موجود ہو۔ قرآن بھی اس بارے میں جو کچھ بتلاتا ہے وہ اتنا ہی ہے۔ اس سے زیادہ جو کچھ ہے مذہبی عقیدہ کا معاملہ نہیں ہے اس لئے وہ اس کا بوجھ جماعت کے افکار پر نہیں ڈالتا بلکہ اُسے اصحابِ جہد و طلب کے لئے چھوڑ دیتا ہے:۔

---

[1] "انڈین فلاسفی" از ڈاکٹر رادھا کرشنن جلد اول۔ صفحہ ۱۱۹۔ دوسرا ایڈیشن

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْ فِیْنَا	اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کے لئے کوشش کرینگے
لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (۲۹۔ آخری آیت)	تو ہم بھی ضرور ان پر راہ کھول دیں گے۔
وَفِی الْاَرْضِ آیَاتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ	اور ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں
وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ	زمین میں کتنی ہی حقیقت کی نشانیاں ہیں
(۵۱: ۲۱)	اور خود تمہارے اندر بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں

اسی مقام سے وہ فرقِ مراتب بھی نمایاں ہو جاتا ہے جو اسلام نے بالکل ایک مختلف شکل و نوعیت میں عوام و خواص کے درمیان ملحوظ رکھا ہے، ہندو مفکروں نے سماج کے مختلف طبقات میں الگ الگ تصور اور عقیدے تقسیم کئے لیکن اسلام نے تصور اور عقیدہ کے اعتبار سے اس قسم کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ وہ ہر انسانی دل و دماغ کے آگے حقیقت کا ایک ہی عقیدہ پیش کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ طلب و جہد کے لحاظ سے سب کے مراتب یکساں نہیں ہو سکتے' ہر طالبِ حقیقت ایک ہی قسم کی تشنگی لے کر نہیں آتا' عامۃ الناس بحیثیت ایک طبقہ کے اپنا ایک خاص مزاج اور اپنی خاص احتیاج رکھتے ہیں لیکن خاص افراد بہ حیثیت فرد کے اپنی طلب و استعداد کا الگ الگ درجہ و مقام رکھتے ہیں اور اُن کے لئے عرفان و یقین کی راہیں کُھلی چھوڑ دی گئی ہیں۔

صحیح بخاری اور مُسلم کی ایک متفق علیہ حدیث ہے جو نہایت جامع اور مانع الفاظ میں اس فرقِ مراتب کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ حدیث تین مرتبوں کا ذکر کرتی ہے۔ اسلام' ایمان اور احسان۔ اسلام یہ ہے

کہ اسلامی عقیدہ کا اقرار کرنا اور عمل کے چاروں ارکان یعنے نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ کو انجام دینا، ایمان یہ ہے کہ اقرار کے مرتبہ سے آگے بڑھنا اور اسلام کے بنیادی عقائد کے حق الیقین کا مرتبہ حاصل کرنا اور احسان یہ ہے کہ:۔

اِنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ وَ اِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (صحیحین)

تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے گویا اُسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اُسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

پہلا مرتبہ اسلامی دائرہ کے عام اعتقاد و عمل کا ہے۔ یعنی جس نے اسلامی عقیدہ کا اقرار کر لیا اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار کر لی وہ اس دائرہ میں آگیا لیکن محض دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ علم و یقین کے مقامات بھی حاصل ہو گئے۔

پہلا مرتبہ صرف اُس کے خارجی اور ابتدائی پہلو کا مظہر ہوتا ہے دوسرا مرتبہ ایمان کا ہے، یہ انسان کے دل و دماغ کا یقین و اذعان ہے، یہ مرتبہ جس نے حاصل کر لیا وہ خواص کے زمرہ میں داخل ہو گیا لیکن معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا، عرفانِ حقیقت اور عین الیقینی ایقان کا ایک اور مرتبہ اس کے بعد آتا ہے جسے احسان سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن یہ مقام محض اعتقاد اور یقین پیدا کر لینے کا نہیں ہے جو ایک جماعت یا گروہ کو بحیثیت جماعت یا گروہ کے حاصل ہو جا سکتا ہے۔ یہ مقام ذاتی تجربہ و کشف سے حاصل ہوتا ہے محض تعلیمی عقائد یا فکری قیاسات سے اس

مرتبہ تک رسائی نہیں ہوتی۔ یہ سیکھنے اور بتلانے کا معاملہ نہیں، ذاتی تجربہ وکشف کا معاملہ ہے۔ جو یہاں تک پہنچ گیا وہ اگر کچھ بتلائے گا تو بھی یہی بتلائے گا کہ میری طرح بن جاؤ پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے دیکھ لو ؂

پُرسید یکے کہ عاشقی چیست   گفتم کہ چو من شوی بدانی

اسلام نے اس طرح طلب وجہد کی روحانی پیاس کے لئے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان مُہیا کر دیا۔ عام آدمی کے لئے پہلا مرتبہ ہے، زیادہ ترقی یافتہ انسان کے لئے دوسرا مرتبہ اور خاصانِ خاص کے لئے تیسرا مرتبہ۔ ہر چند کہ ہر ایک کے لئے جام الگ الگ ہیں لیکن پیاس بجھانے کے واسطے میخانہ ایک ہی ہے، ہر ایک کے حصہ میں اس کے ظرف کے مطابق ایک جام آجاتا ہے ؂

ساقی بہ ہمہ، بادہ زیک خُم دہد اما   در مجلس اُو مستی ہر کس زشرابے ست

یہاں اس امر کی جانب اشارہ کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ علمائے اسلام خصوصاً صوفیائے کرام نے خدا کے بارے میں ایک تصور قائم کیا ہے جو عام طور سے نظریۂ وحدت الوجود کہلاتا ہے۔ توحیدِ وجودی کے قائل قرآن کی مختلف آیات سے اس نظریہ پر استدلال لاتے ہیں مثلاً:۔

"ھُوَ الاَوَّلُ وَ الاٰخِرُ وَالظَّاہِرُ وَالبَاطِنُ" "اَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہ" اور "وَ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡد" اور "کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَان" وغیرہ وغیرہ

دہلی کے مشہور محدث شاہ ولی اللہ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ

"اگر میں مسئلۂ وحدت الوجود کو ثابت کرنا چاہوں تو قرآن و حدیث کے تمام نصوص و ظواہر سے اس کا اثبات کر سکتا ہوں" لیکن مولانا آزاد متنبہ کرتے ہیں کہ "اس بارے میں صاف بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ ان تمام تصریحات کو ان کے قریبی محامل سے دور نہیں لے جانا چاہئے اور ان معانی سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے جو صدرِ اول کے مسلمانوں نے سمجھے تھے۔ باقی رہا حقیقت کے کشف و عرفان کا وہ مقام جو عُرفاءِ طریق کو پیش آتا ہے تو وہ کسی طرح بھی قرآن کے تصورِ الٰہی کے عقیدہ کے خلاف نہیں قرآن کا تصورِ الٰہی ایک جامع تصور ہے اور ہر توحیدی تصور کی اُس میں گنجائش ہے۔ جو افرادِ خاصہ مقامِ احسان تک رسائی حاصل کرتے ہیں وہ حقیقت کو اس کی پسِ پردہ جلوہ طرازیوں میں بھی دیکھ لیتے ہیں اور عرفان کا وہ منتہیٰ مرتبہ جو فکرِ انسان کی دسترس میں ہے انھیں حاصل ہوتا ہے۔"

باب دوم

صفتِ ربوبیت

صفاتِ الٰہی کے ذکر میں مولانا آزاد ایک عام جائزہ لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ کائنات کے نظامِ ہستی میں وحدتِ وجود کا جلوہ وحدتِ صفات کی شکل میں دکھائی دیتا ہے یعنی صفاتِ الٰہی کا الگ الگ اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ظاہر ہوتی ہیں تاکہ زندگی میں ہم آہنگی کا جلوہ نظر آئے۔ سورۂ فاتحہ یا قرآن کے افتتاحی باب میں خدا کی چند بنیادی صفات کا ذکر کیا گیا ہے جیسے ربوبیت، رحمت، عدالت اور ہدایت کی صفات۔ مولانا آزاد اپنی تفسیر میں بالترتیب اِن صفات پر روشنی ڈالتے ہیں اور پورے قرآن سے اُن کی جلوہ نمائی کے ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ خدا کی اولین صفت یعنی ربوبیّت کا ذکر کرتے ہیں جو قرآن کی توجہ کا مرکز ہے۔

ربوبیت کی اصطلاح 'رب' سے نکلی ہے جو سامی زبانوں کے کئی الفاظ کا مشترک مادہ ہے۔ عبرانی، عربی اور سُریانی تینوں زبانوں میں 'رب' کے معنی پالنے والے کے ہیں یا ایسی ہستی کے جو اسبابِ پرورش مہیا کرتی ہے۔ چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے اس لئے 'رب' کے لفظ کو جو معنی عطا کئے گئے گویا وہ خدا کے

تصور کا پہلا قدرتی زینہ تھے جس کے بارے میں ابتدائی سامی ذہن نقش آرائی
کرسکتا تھا۔ 'رب' کے معنی معلّم، آقا، یا خدا کے بھی ہیں۔ قرآنی زبان
میں اس لفظ کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں استعمال کیا گیا ہے
اسی لئے بعض علمائے لغت نے 'ربوبیت' کی تعریف اِن لفظوں میں کی
ہے۔ "هُوَ اِنْشَاءُ الشَّیْءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَام" یعنی کسی چیز کو یکے
بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح
نشو و نما دیتے رہنا کہ اپنی حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ یعنی ربوبیت کے لئے
ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور
ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لئے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش
آتی رہیں ان سب کا سر و سامان ہوتا رہے۔ لیکن قرآنی تصور کے لحاظ سے
مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ ربوبیت میں محبت و شفقت کا لگاؤ ضروری ہے
وہ ایک تمثیل کے ذریعہ ان معنوں کی وضاحت کرتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا
ہوتا ہے اور زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے سب کی سب پرورش
و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت و شفقت، حفاظت و نگہداشت
اور بخشش و اعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے اور اُس وقت تک جاری
رہتا ہے جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کے حدِ بلوغ تک نہ پہنچ جائے، پھر
پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں بے شمار ہیں، ان کی نوعیت ہمیشہ بدلتی
رہتی ہے اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی

کی نگاہ اور نگرانی کا سر و سامان ملتا رہے۔ حکمتِ الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدوخال پیدا کر دئے ہیں۔ یہ ماں کی ربوبیت ہی ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچہ کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریاتِ پرورش کا سر و سامان مہیا کرتی رہتی ہے۔ جب بچہ کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا تو اُسے دودھ ہی پلایا جاتا ہے، جب دودھ سے قوی غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو ویسی ہی غذا دی جانے لگتی ہے، جب تک بچہ میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں ہوتی تو ماں اُسے گود میں اٹھائے پھرتی ہے۔ جب وہ کھڑے ہونے کے قابل ہو جاتا ہے تو ماں اس کی انگلی پکڑ کر اُسے ایک ایک قدم چلاتی ہے۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہے وہ صورتِ حال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جا سکتا ہے۔" قرآن نے رب کی حیثیت سے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے، اس تمثیل کی روشنی میں اسے آسانی سے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے خدا کے ساتھ رب العالمین کی صفت کو وابستہ کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کسی خاص قوم یا گروہ کا رب یا پالنے والا نہیں ہے بلکہ وہ بنی نوع انسان اور کائناتِ ہستی کی تمام مخلوقات کا رب ہے۔

نظامِ ربوبیت مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ ربوبیتِ الٰہی کا عمل ایک معینہ نظام کے تحت ہے، ہر وجود کو ہر حالت

ہیں زندگی اور بقا کے لئے جو کچھ مطلوب تھا وہ سب کچھ مل رہا ہے، چیونٹی زمین پر رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے، کوڑے کرکٹ میں اپنا راستہ پیدا کر لیتے ہیں، مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں، پھول باغوں میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں گھوم رہے ہیں اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں لیکن فطرت کے پاس یکساں طور پر سب کے لئے پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضانِ ربوبیت سے محروم ہو۔ مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی بھی ہیں جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ ہماری آنکھ انھیں دیکھ بھی نہیں سکتی لیکن ربوبیتِ الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم مخلوق کے لئے سامانِ پرورش ونگہداشت مہیا کر دیا ہے، ٹھیک اُسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ اُن کے لئے بھی زندگی اور بقا کی ہر چیز مہیا کر دی اور یہ جو کچھ ہے انسان کے وجود سے باہر ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے تو خود اُس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیتِ الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○

(۵۱ : ۲۰ : ۲۱)

ان لوگوں کے لئے جو (سچائی پر) یقین رکھنے والے ہیں زمین میں (خدا کی کار فرمائیوں کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

خارجی پہلو سامانِ زندگی کی بخشائش اور ربوبیت کے عمل میں جو فرق ہے، قرآن اس فرق کو واضح کرتا ہے۔ دنیا میں ایسے عناصر، ایسی قوتیں اور ان کی ایسی مختلف شکلیں اور بناوٹیں موجود ہیں جو زندگی کی ترقی اور نشو و نما کے لئے سودمند ہیں لیکن محض ان کی موجودگی ربوبیت سے تعبیر نہیں کی جاسکتی۔ ایسا ہونا قدرتِ الٰہی کی رحمت ہے مگر وہ بات نہیں جسے ربوبیت کہتے ہیں، ربوبیت یہ ہے کہ ان اشیاء کی بخشش و تقسیم کا بھی ایک نظام موجود رہے۔ مثلاً زندگی کے لئے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے لیکن پانی کی وافر موجودگی بجائے خود زندگی کے لئے کافی نہیں جب تک کہ ایک مقررہ مقدار اور ایک خاص وقت و انتظام کے ساتھ پانی موجود نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے پانی جیسا جوہرِ حیات پیدا کر دیا لیکن یہ اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی، زمین کے گوشے گوشے تک پہنچاتی ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی، ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرّے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیراب کر دیتی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً	اور (دیکھو) ہم نے آسمان سے ایک خاص
بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ	انداز کے ساتھ پانی برسایا پھر اسے
وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ	زمین میں ٹھیرائے رکھا اور ہم اس پر
فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ	بھی قادر ہیں کہ (جس طرح برسایا تھا

نَخِیلٍ وَّ اَعْنَابٍ لَکُمْ فِیْھَا فَوَاکِہُ کَثِیْرَۃٌ وَّ مِنْھَا تَاْکُلُوْنَ (۲۳ : ۱۸ : ۱۹)

اسی طرح، اسے واپس لے جائیں، پھر (دیکھو، اسی پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کر دیے جن میں بے شمار پھل لگتے ہیں اور انھیں سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔

قرآن نے جابجا اشیاء کی قدر اور مقدار کا ذکر کیا ہے یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطرتِ کائنات جو کچھ بخشتی ہے ایک خاص اندازہ کے ساتھ بخشتی ہے اور یہ اندازہ ایک خاص نظام کے تحت ہوتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵ : ۲۱)

اور کوئی شے نہیں ہے جس کے ہمارے پاس ذخیرے موجود نہ ہوں لیکن (ہمارا طریقِ کار یہ ہے کہ) جو کچھ نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں)

وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ (۱۳ : ۸)

اور اللہ کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (۵۴ : ۴۹)

ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں ایک اندازہ کے ساتھ پیدا کی ہیں۔

غور کیجیے! دنیا میں صرف یہی نہیں ہے کہ پانی موجود ہے بلکہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ موجود ہے یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر سے ڈول بھر بھر کر فضا میں پانی کی چادریں بچھا دیں پھر ہواؤں کے جھونکے

انھیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسائیں۔ پھر یہ کیوں ہے، کہ جب کبھی پانی برسے تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے اور اس طرح برسے کہ زمین کی بالائی سطح پر اُس کی ایک خاص مقدار بہنے لگے اور ایک خاص مقدار زمین کے اندرونی حصوں میں جذب ہو جائے۔ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں اور پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں، پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سر چشمے اُبلنے لگتے ہیں، پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں، پھر یہ جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئی دور دور تک دوڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں، ہزاروں میلوں تک زمین کو سیراب کر دیتی ہیں؟

کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا، کیوں کسی دوسرے انداز سے نہ ہوا؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے، اس لئے کہ کائناتِ ہستی میں ربوبیتِ الٰہی کارفرما ہے اور ربوبیت کا مقتضا یہی تھا کہ پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب و مقدار سے تقسیم ہو۔ یہ رحمت و حکمت تھی جس نے پانی پیدا کیا لیکن یہ ربوبیت ہے جو اسے اس طرح کام میں لائی کہ ہر مخلوق کی پرورش اور رکھوالی کی ضرورتیں پوری ہو گئیں۔

اللّٰهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ	یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں، پھر ہوائیں بادلوں کو چھیڑ کر حرکت میں لاتی ہیں، پھر وہ جس طرح چاہتا ہے انھیں فضا میں پھیلا دیتا ہے اور

مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (۳۰ : ۴۸)

انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ بادلوں میں سے مینہ نکل رہا ہے، پھر جن لوگوں کو بارش کی یہ برکت ملنی تھی مل چکتی ہے تو وہ اچانک خوش وقت ہو جاتے ہیں۔

زندگی کے لئے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی انہی کی بخشائش سب سے زیادہ اور عام ہے اور اسی طرح جن کی ضرورت خاص خاص حالتوں یا خاص خاص موقعوں کے لئے تھی اُن میں اختصاص اور مقامیت پائی جاتی ہے۔ ہوا سب سے زیادہ ضروری تھی، کیونکہ پانی اور غذا کے بغیر کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں پس اس کا سامان اتنا وافر اور عام ہے کہ زمین کا کوئی گوشہ نہیں جو کسی وقت بھی اس سے خالی ہو، ہوا کے بعد دوسرے درجہ پر پانی ہے اس لئے اس کی بخشائش کی فراوانی اور عمومیت کا درجہ ہوا کے بعد ہے۔ دنیا کے ہر حصہ میں زمین کے اوپر ہر طرف دریا رواں ہیں اور زمین کے نیچے بھی پانی کے سوتے بہہ رہے ہیں پھر ان دونوں ذخیروں کے علاوہ فضائے آسمانی کا بھی کارخانہ ہے جو شب و روز سرگرم کار رہتا ہے، وہ سمندر کا شورابہ کھینچتا ہے اُسے صاف و شیریں بنا کر جمع کرتا رہتا ہے پھر حسبِ ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے ہوا اور پانی کے بعد غذا کی ضرورت تھی لہذا ہوا اور پانی سے کم مگر اور تمام چیزوں سے زیادہ اس کا دسترخوانِ کرم پورے کرۂ ارض پر بچھا ہوا ہے

اور کوئی مخلوق نہیں جس کے گردوپیش اُس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔

پھر سامانِ پرورش کے اس عالمگیر نظام پر غور کرو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام کارخانہ صرف اس لئے بنا ہے کہ زندگی بخشے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے۔ سورج اس لئے ہے کہ روشنی کے لئے چراغ کا اور گرمی کے لئے تنور کا کام دے اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے، ہوائیں اس لئے ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں، کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بنا دیں اور کبھی ابر کو پانی بنا کر برسا دیں، زمین اس لئے ہے کہ نشو و نما کے خزانوں سے ہمیشہ معمور رہے اور ہر دانے کے لئے اپنی گود میں زندگی اور ہر پودے کے لئے اپنے سینے میں پرورش رکھے۔ مختصر یہ کہ کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ صرف اسی کام میں لگا ہوا ہے، ہر قوت اپنی استعداد کا مظاہرہ کر رہی ہے اور ہر علت اپنی تاثیر کے اظہار میں لگی ہوئی ہے جوں ہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشو و نما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے معاً تمام کارخانۂ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے سورج کی تمام کارفرمائیاں فضا کے تمام تغیرات، زمین کی تمام قوتیں اور عناصر کی تمام سرگرمیاں صرف اسی انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور کب دہقان کی جھولی سے ایک دانہ زمین پر گرتا ہے:۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ

اور آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے سب کو اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے بلاشبہ

فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○ (۴۵ : ۱۳)

ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس بات میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ نمایاں حقیقت نظامِ ربوبیت کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے۔ یعنی ہر وجود کی پرورش کا سر و سامان جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے اور ایک ہی اصل و قاعدہ رکھتا ہے، پتھر کا ایک ٹکڑا گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے لیکن دونوں کو ایک ہی طریقہ سے سامانِ پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح پالے پوسے جا رہے ہیں، ایک انسان کا بچہ اور درخت کا ایک پودا، بظاہر دو الگ الگ حیثیتوں کے مظہر دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی نشو و نما کے طریقوں کا کھوج لگانے سے پتہ چلتا ہے کہ قانونِ پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے، پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی، انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا، سب کے لئے پیدائش کا وقت مقرر ہے اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے سامانِ پرورش مہیا ہو جاتا ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے طفولیت، رشد و بلوغ، شباب سنِ کمال اور بالآخر ضعف و انحطاط کی منزلیں آتی ہیں، زندگی کے ظہور، نشو و نما اور زوال و انحطاط کا افسوں سب کے لئے یکساں ہے:۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا ہے کہ پہلے ناتوانی کی حالت

ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ (۳۰ : ۴۵)

ہوتی پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے، پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (۳۹ : ۲۱)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا زمین میں اس کے چشمے رواں ہو گئے۔ پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کے کھیتیاں لہلہا اٹھیں پھر ان کی نشو ونما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہو گئیں، پھر ترقی کے بعد زوال طاری ہوا اور) تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھا گئی پھر بالآخر خشک ہو کر چورا چورا ہو گئیں بلاشبہ دانشمندوں کے لئے اس صورتِ حال میں بڑی ہی عبرت ہے۔

جہاں تک غذا کا تعلق ہے، حیوانات میں ایک قسم اُن جانوروں کی ہے جن کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں اور ایک ان کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں، غور کرو! انظامِ ربوبیت نے دونوں کی پرورش کے لئے کیسا عجیب سر و سامان مہیا کر دیا ہے، انسان کو لے لو۔ جوں ہی وہ پیدا ہوتا ہے اس کی غذا اپنی ساری خاصیتوں اور مناسبتوں کے ساتھ

خود بخود مہیا ہو جاتی ہے اور ایسی جگہ مہیا ہوتی ہے جو اس کے لئے سب سے قریب اور موزوں ہوتی ہے، ماں اپنے نومولود بچے کو جوشِ محبت میں سینے سے لگا لیتی ہے اور وہیں اُس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے۔ پھر دیکھو! اس غذا کی نوعیت اور مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بدرجہ کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے اور کس طرح یکے بعد دیگرے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ابتداء میں بچہ کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اُسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہیئے۔ چنانچہ نہ صرف انسان میں بلکہ تمام حیوانات میں ماں کا دودھ بہت ہی پتلے قوام کا ہوتا ہے لیکن جوں جوں بچے کی عمر اور معدہ قوی ہوتا جاتا ہے دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے یہاں تک کہ بچے کا عہدِ رضاعت پورا ہو جاتا ہے اور اس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے اور اس منزل پر ماں کا دودھ خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے، یہ گویا ربوبیتِ الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب اس کے لئے دودھ کی ضرورت نہیں رہی بلکہ وہ ہر طرح کی غذائیں استعمال کر سکتا ہے۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا وَّحَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (۴۶ : ۱۵)	اس کی ماں نے اُسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا، اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت (کم از کم) تیس مہینوں کی ہے۔

پھر دیکھو! کارسازِ فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچے

کی عمر بڑھتی جاتی ہے، محبتِ مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے
یہ محبتِ مادری ہے جو ماں کے دل میں شریف ترین جذبات کو نشوونما
دیتی ہے اور اپنے بچے کی خاطر وہ بڑی سی بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں
کرتی۔ پھر جوں جوں بچہ بڑھتا جاتا ہے محبتِ مادری کے جذبہ کی شدت
کم ہوتی جاتی ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے جبکہ یہ جذبہ حیوانات میں تو
بالکل باقی نہیں رہتا لیکن انسان میں بھی اُس کی گرمجوشیاں باقی
نہیں رہتیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی محبت کا ایک
عظیم ترین جذبہ ماں کے دل میں موجزن ہو جائے اور پھر ایک خاص
وقت تک قائم رہ کر رفتہ رفتہ غائب ہو جائے؟ اس لئے کہ یہ نظامِ ربوبیت
کی کارفرمائی ہے اور اس کا مقتضیٰ یہی تھا۔ ربوبیت چاہتی
ہے کہ جب تک بچے کو پرورش کی احتیاج باقی رہے اس کی پرورش ہو
اس لئے ماں کی محبت میں بھی بچے کی پرورش کا جوش اتنا ہی زیادہ تھا
جب بچے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی
تو اُس ذریعہ کی ضرورت بھی باقی نہ رہی۔ اب اس کا باقی رہنا ماں
کے لئے بوجھ اور بچے کی نشوونما کے لئے رُکاوٹ بن جاتا ہے بچے کی احتیاج
کا سب سے نازک وقت اس کی نئی نئی طفولیت تھی اسی لئے ماں کی
محبت میں بھی سب سے زیادہ جوش اسی وقت تھا پھر جوں جوں بچہ
بڑھتا گیا، یہ احتیاج کم ہوتی گئی بلا شبہ ماں کی محبت اپنے بچے کے لئے ہمیشہ
زندہ رہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے لیکن اس کی محض ایک

سماجی قدر ہوتی ہے۔ بچے کی طفولیت کے عہد میں محبتِ مادری کا جو فطری اور جبلّی جوش ہوتا ہے وہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

انسان اور حیوانات کے بچوں کی پرورش میں ضرور تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً جب انڈے سے مرغی کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت دودھ پینے والے بچوں سے مختلف ہوتی ہے وہ اول دن سے ہی معمولی اور عام غذائیں کھا سکتے ہیں بشرطیکہ کھلانے کے لئے کوئی شفیق نگرانی موجود ہو۔ چنانچہ جوں ہی مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتا ہے اپنی غذا ڈھونڈنے لگتا ہے اور ماں چُن چُن کر غذا اس کے سامنے ڈالتی جاتی ہے اور منھ میں لے لے کر کھانے کا طریقہ بتاتی جاتی ہے یا ایسا کرتی ہے کہ خود کھا لیتی ہے مگر ہضم نہیں کرتی، اپنے اندر اُسے ہلکا اور نرم بنا کر محفوظ رکھتی ہے اور جب بچہ اپنی غذا کے لئے منھ کھولتا ہے تو اس میں اتار دیتی ہے۔

ربُوبیتِ معنوی پھر اس سے بھی عجیب تر نظامِ ربوبیت کا معنوی پہلو ہے خارج میں زندگی اور پرورش کا کتنا ہی سروسامان کیا جاتا، مفید نہیں ہو سکتا تھا اگر ہر وجود کے اندر اُس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد ودیعت نہ ہوتی پس یہ ربوبیت ہی کا فیضان ہے کہ ہر مخلوق کی ظاہری اور باطنی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اُس کی ہر قوت اس کے سامانِ پرورش کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے اور اس کی ہر چیز اُسے زندہ رہنے اور نشو و نما پانے میں مدد دیتی ہے

کوئی مخلوق اپنے جسم و قویٰ کی ایسی نوعیت نہیں رکھتی جو اس کے حالاتِ پرورش کے تقاضوں کے خلاف ہو۔

اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے زندگی کی دو حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے جن کی طرف قرآن نے بار بار متوجہ کیا ہے۔ ایک وہ ہے جسے تقدیر کہتے ہیں، انگریزی میں اس کے لئے 'قسمت' کا عام سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور دوسری حقیقت عبارت ہے 'ہدایت' سے۔

تقدیر تقدیر کے معنی کسی چیز کے لئے ایک خاص طرح کی حالت ٹھیرا دینے کے ہیں خواہ یہ ٹھیراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی قویٰ کے لئے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھیرا دیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتا اور یہ اندازہ ایسا ہے جو اس کی زندگی اور نشوونما کے تمام احوال و ظروف سے ٹھیک مناسبت رکھتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵ : ۲)

اور اس نے تمام چیزیں پیدا کیں پھر ہر چیز کے لئے (اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق) ایک خاص اندازہ ٹھیرا دیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ ہر گردوپیش میں اور اس کی پیداوار میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے اور ایسا کیوں ہے کہ ہر مخلوق اپنی ظاہری و باطنی بناوٹ میں ویسی ہی ہوتی ہے جیسا اس کا گردوپیش ہے اور ہر گردوپیش ویسا ہی ہوتا ہے جیسی اس کی مخلوقات ہوتی ہے؟ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ یہ اس حکیم و قدیر کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر ہے اور اس نے ہر چیز کی

خلقت وزندگی کے لئے ایسا ہی اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اس کا یہ قانونِ تقدیر صرف حیوانات ونباتات ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ کائناتِ ہستی کی ہر چیز کے لئے ہے یہاں تک کہ سیاروں کا نظام بھی اسی سے وابستہ ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۳۶ : ۳۸)

اور (دیکھو) سورج کے لئے جو قرارگاہ ٹھہرادی گئی ہے، وہ اسی پر چلتا ہے اور یہ عزیز وعلیم خدا کی اس کے لئے تقدیر ہے۔

مخلوقات اور اس کے گرد وپیش کی مطابقت کا یہی قانون ہے جس نے دونوں میں باہمدگر مناسبت پیدا کر دی ہے اور ہر مخلوق اپنے چاروں طرف وہی پاتی ہے جس میں اس کے لئے پرورش اور نشو ونما کا سامان ہوتا ہے، اُڑنے والا پرند، تیرنے والی مچھلی، چلنے والے چوپائے، رینگنے والے حشرات، اِن میں سے ہر ایک کو ویسا ہی جسم ملا ہے جو اُس کے گرد وپیش کے لئے موزوں ہے۔ دریا میں پرند نہیں پیدا ہوتا اس لئے کہ یہ گرد وپیش اس کے تقاضائے پرورش کے مطابق نہیں، خشکی میں مچھلی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ خشکی اس کی حیات کے لئے موزوں نہیں۔ اگر فطرت کی اس تقدیر کے خلاف ایک خاص گرد وپیش کی مخلوق دوسرے قسم کے ماحول میں چلی جاتی ہے تو، یا تو وہاں زندہ نہیں رہتی یا زندہ رہتی ہے تو پھر بتدریج اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی اس گرد وپیش میں ہونی چاہئے پھر اُن میں سے ہر نوع کے لئے مقامی موثرات کے مختلف گرد وپیش ہیں، سرد آب وہوا کی پیداوار سرد آب وہوا کے لئے ہے اور گرم آب وہوا کی مخلوق گرم آب و

ہوا کے لئے ہے، قطبِ شمالی کے قرب وجوار کا ریچھ خطِ استوا کے قریب میں نظر نہیں آسکتا اور منطقۂ حارّہ کے جانور منطقۂ باردہ میں مفقود ہیں اور یہی قانونِ فطرت یا قانونِ تقدیر ہے۔ آئیے اب ہم ربوبیت کے دوسرے عنصر یعنی ہدایت پر نظر ڈالیں۔

ہدایت ہدایت کے معنی راہ دکھانے، راہ پر لگانے، رہنمائی کرنے کے ہیں اور اس کے مختلف مراتب و اقسام ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی، یہاں صرف اُس ابتدائی مرتبۂ ہدایت کا ذکر کرنا ہے جو تمام مخلوقات پر اُن کی پرورش کی ضروری راہیں کھولتا، انھیں زندگی کی راہ پر لگاتا اور ضروریاتِ زندگی کی طلب و حصول میں رہنمائی کرتا ہے۔ فطرت کی یہ ہدایت ربوبیت کی ہدایت ہے اور اگر یہ ہدایت، ربوبیت کی دستگیر نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی دنیا کے سامانِ حیات و پرورش سے فائدہ اٹھا سکتی اور زندگی کی سرگرمیاں ظہور میں آسکتیں۔ اس کے بغیر سازِ ہستی ہی خاموش ہو جاتا قرآن کہتا ہے کہ یہ ہدایت، وجدان کا فطری الہام اور حواس و ادراک کی قدرتی استعداد ہے۔ یہ فطرت کی وہ رہنمائی ہے جو ہر مخلوق کے اندر پہلے وجدان کا الہام بن کر نمودار ہوتی ہے پھر حواس و ادراک کا چراغ روشن کر دیتی ہے۔ یہی وہ باطنی قوت ہے جو ہر مخلوق کو زندگی اور پرورش کی راہوں پر لگا دیتی ہے۔ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا جوں ہی شکمِ مادر سے باہر آتا ہے جبلی طور پر معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے اور جب پستان منھ میں لیتا ہے تو خود بخود انھیں چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ بلّی کے

بچوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں، اُن کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں لیکن ماں جوشِ محبت میں انھیں چاٹ رہی ہے اور وہ اس کے سینے پر منھ مار رہے ہیں! یہ بچہ جس نے عالمِ ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، جسے خارج کے موثرات نے چھوا تک نہیں، جبلّی طور پر معلوم کر لیتا ہے کہ اُسے پستان منھ میں لے لینا چاہئے اور اس کی غذا کا سرچشمہ یہیں ہے۔ یہی وہ وجدانی ہدایت ہے جو قبل اس کے کہ حواس وادراک کی روشنی نمودار ہو بچے کو اس کی پرورش وزندگی کی راہوں پر لگا دیتی ہے۔

اگر تمہارے گھر میں بلّی ہے تو تم نے دیکھا ہوگا کہ جب وہ حاملہ ہوتی ہے تو کیا کرتی ہے؟ سمجھو کہ وہ پہلی مرتبہ حاملہ ہوئی ہے اس حالت کا اُسے کوئی تجربہ نہیں لیکن جوں ہی وضع حمل کا وقت قریب آتا ہے وہ کسی محفوظ گوشے کی جستجو شروع کر دیتی ہے اور کسی مناسب جگہ کے لئے مکان کا ایک ایک کونہ دیکھتی پھرتی ہے پھر خود بخود ایک علیحدہ اور محفوظ ترین گوشہ چھانٹ لیتی ہے اور وہاں بچہ دیتی ہے، پھر یکایک اس کے اندر بچے کی حفاظت کی طرف سے ایک مجہول خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے، یہ کون سی قوت ہے جو بلّی کے اندر یہ خیال پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے پیدا ہونے والے بچے کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرے کیونکہ عنقریب اُسے ایسی جگہ کی ضرورت ہوگی؟ یہ کونسا الہام ہے جو اُسے خبردار کر دیتا ہے کہ بلّا بچوں کا دشمن ہے اور اُن کی بو سونگھتا پھرتا ہے اس لئے جگہ بدلتے رہنا چاہئے۔ بلاشبہ یہ ربوبیتِ الٰہی کی وجدانی ہدایت ہے

جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہے اور جو اُن پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔

ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مُدرکاتِ ذہنی کی ہدایت ہے' اگرچہ حیوانات اُس جوہرِ دماغ سے محروم ہیں جسے فکر و عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے تاہم فطرت نے انھیں بھی اُن کی ضرورت کے مطابق احساس و ادراک کی اتنی قوت عطا کر دی ہے جو انھیں اپنی زندگی اور معیشت کے لئے درکار تھی اور جس کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے' کھانے پینے' توالد و تناسل اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں لیکن حواس و ادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لئے ایک ہی طرح کی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو اُس کی ضرورت اور مقتضیات کے مطابق عطا کی گئی ہے۔ چیونٹی کی قوتِ شامّہ بہت دور رس ہوتی ہے اس لئے کہ اسی قوت کے ذریعہ اُسے اپنی غذا حاصل کرنا ہوتی ہے۔ چیل اور عقاب کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں پرواز کرتے ہوئے وہ اپنا شکار نہ دیکھ سکیں۔ یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے کہ حیوانات کے حواس و ادراک کی یہ حالت اول دن سے تھی یا احوال و ظروف کی ضروریات اور قانونِ مطابقت کے موثرات سے بتدریج ظہور میں آئی اس لئے کہ خواہ کوئی صورت ہو بہر حال یہ فطرت کی بخشی ہوئی استعداد ہے۔

اب یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن کے مطابق ہر مخلوق کے لئے اُس کی

پرورش و معیشت کا ایک مکمل نظام کار فرما ہے جو ربوبیتِ الٰہی کا مظہر ہے یہی ربوبیت ہے جس نے ہر وجود کو اس کی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے مناسب و موزوں سامانِ پرورش (تسویہ) عطا کیا اور ہر مخلوق کے لئے اس کے خواص کے مطابق ایک خاص طرح کا اندازہ (تقدیر) ٹھیرا دیا اور پھر ہر مخلوق کو ایک ایسا خارجی اور معنوی ادراک (ہدایت) بخشا کہ وہ دنیا کے سامانِ حیات سے پرورش و معیشت کا پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔ قرآن نے ربوبیت کے اِن مراتب کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَ	وہ پروردگار عالم جس نے پیدا کیا پھر اُسے
الَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی	ٹھیک ٹھیک درست کر دیا اور جس نے
(۸۷ : ۲ : ۳)	ہر وجود کے لئے ایک اندازہ ٹھیرا دیا پھر
	اس پر راہ (عمل) کھول دی۔

غایتِ حقیقی

اس طرح قرآن نے اُن مظاہرِ تخلیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو کائناتِ حیات میں سرگرمِ عمل ہیں، ربوبیتِ الٰہی کے مراتب بیان کئے ہیں جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ نہ صرف توحیدِ الٰہی کا ثبوت فراہم کیا جائے بلکہ ذہنِ انسانی پر یہ امر بھی آشکارا کر دیا جائے کہ کائناتِ خلقت اور اس کی ہر مخلوق کی بناوٹ کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ایک خاص مقصد کے تحت ایک خاص نظام و قانون میں باہمدگر منسلک ہے اور کوئی چیز نہیں جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت اور

بِالْحَقِّ ۚ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۲۹ : ۴۴)	مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور بلاشبہ اس بات میں ارباب ایمان کے لئے (معرفت حق کی) ایک بڑی ہی نشانی ہے۔
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (۳۰ : ۹۱)	اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تونے اس لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ محض ایک بیکار و عبث سا کام ہو۔

تخلیق کے اس مقصدی پہلو کو مولانا آزاد نے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے۔ "بالحق" کا لفظ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے جس کا مقصد اس بات پر توجہ دلانا ہے کہ کائناتِ ہستی کی کوئی چیز ایسی نہیں جس میں زندگی کے لئے افادہ و فیضان نہ ہو، فطرت خود یہ چاہتی ہے کہ وہ جو کچھ بنائے اس طرح بنائے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لئے نفع و راحت ہو :۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ یُکَوِّرُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ وَیُکَوِّرُ النَّھَارَ عَلَی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ (۳۹ : ۵)	اس نے آسمانوں اور زمینوں کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اس نے رات اور دن کے اختلافات اور ظہور کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹی جاتی ہے اور دن رات پر لپٹا آتا ہے اور سورج اور چاند دونوں کو اس کی قدرت نے مسخر کر رکھا ہے سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے مقررّہ وقت تک کے لئے گردش کر رہے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ○ (۱۰ : ۵)

وہ (کار فرمائے قدرت) جس نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو روشن بنایا اور پھر چاند کی گردش کے لئے منزلیں ٹھیرا دیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور اوقات کا حساب معلوم کر لو۔ بلاشبہ اللہ نے یہ سب کچھ پیدا نہیں کیا ہے مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ وہ ان لوگوں کے لئے جو جاننے والے ہیں (علم و معرفت کی) نشانیاں الگ الگ کرکے واضح کر دیتا ہے۔

فطرت کے جمال و زیبائی کے لئے بھی یہی "بالحق" کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی فطرت کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کام کر رہا ہے جو چاہتا ہے کہ جو کچھ بنے ایسا بنے کہ اس میں حسن و جمال اور خوبی و کمال ہو:۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۶۴ : ۳)

اس نے آسمانوں کو اور زمینوں کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا اور تمہاری صورتیں بنائیں تو نہایت حسن و خوبی سے بنائیں۔

اسی طرح وہ قانونِ مجازات پر (یعنی جزا و سزا کے قانون پر) اسی تخلیق بالحق سے استشہاد کرتا ہے، دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے جو اپنے عمل سے ایک خاص نتیجہ پیدا کرتی ہے اور یہ تمام خواص و نتائج لازمی اور اٹل ہیں، پھر کیونکر ممکن ہے کہ انسانی اعمال میں بھی اچھے اور برے خواص نہ ہوں

اوران کے ویسے ہی نتائج برآمد نہ ہوں۔ جو قانونِ فطرت دنیا کی ہر چیز میں اچھے برُے کا امتیاز رکھتا ہے کیا انسان کے اعمال میں امتیاز سے غافل ہو جائے گا؟

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ! سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ○ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ

(۴۵ : ۲۱ : ۲۲)

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں، ہم انھیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ یعنی دونوں برابر ہو جائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا فیصلہ یہی ہے تو کیا ہی برا ان کا فیصلہ ہے! اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہر جان اپنی کمائی کے مطابق بدلہ پالے اور ایسا نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو۔

معاد یا مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی اسی "تخلیق بالحق" سے استشہاد کیا گیا ہے، کائنات کی ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ رکھتی ہے پس ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لئے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو اور یہ منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے کیونکہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کائناتِ ارضی کی یہ بہترین مخلوق

صرف اسی لیے پیدا کی گئی ہو کہ پیدا ہو اور چند دن جی کر فنا ہو جائے۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآءِ رَبِّھِمْ لَکٰفِرُوْنَ ۝ (۳۰ : ۸)

کیا اُن لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض بیکار و عبث نہیں بنایا ہے ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لئے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں۔

ربوبیت:۔ توحید پر استدلال

اس موقع پر یہ بات بطورِ خاص قابلِ غور ہے کہ قرآن نے مظاہرِ کائنات کے جن مقاصد و مصالح سے استدلال کیا ہے ان میں سب سے زیادہ عام استدلال ربوبیت کا استدلال ہے۔ مثلاً توحیدِ باری کے تعلق سے اس کا استدلال یہ ہے کہ کائنات کے تمام اعمال و مظاہر کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے والی اور ہر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے اور پھر ایک ایسے نظامِ ربوبیت کا موجود ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے، ہر انسان کو وجدانی طور پر یقین دلا دیتا ہے کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جو ساری کائنات کو زندگی بخشتی ہے اور تمام مخلوقات کی

پرورش کرتی ہے اور اسی لئے ایسی تمام صفات سے متصف ہے جس کی جلوہ آرائی کے بغیر نظامِ کائنات کا ایسا کامل اور بے عیب کارخانہ ہرگز وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

وہ سوال کرتا ہے کہ کیا انسانی وجدان یہ باور کرسکتا ہے کہ نظامِ حیات کا یہ سارا کارخانہ خود بخود عالمِ وجود میں آگیا ہے اور کوئی ارادہ کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہیں ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانۂ وجود کا کوئی کارساز نہ ہو؟ کیا یہ پورا نظامِ حیات محض ایک اندھی بہری فطرت، بے جان مادے اور بے حس الکٹرون کا مظہر ہے اور عقل و ارادہ رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہیں ہے؟

اگر ایسا ہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پروردگاری اور کارسازی کا عمل تو ہر جگہ موجود ہے، مگر کوئی پروردگار اور کارساز موجود نہیں۔ نظم موجود ہے مگر ناظم موجود نہیں، رحمت موجود ہے مگر کوئی رحیم موجود نہیں، یعنی سب کچھ موجود ہے مگر کوئی موجود نہیں۔ انسان کی فطرت مشکل سے ہی یہ باور کرسکتی ہے کہ عمل بغیر کسی عامل کے، نظم بغیر کسی ناظم کے، قیام بغیر کسی قیوم کے، عمارت بغیر کسی معمار کے، نقش بغیر نقاش کے یعنی سب کچھ بغیر کسی موجود کے ظہور پذیر ہوسکتا ہے۔ اس کا وجدان پکار اٹھتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس کی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچہ لیکر آئی ہے جس میں یقین و ایمان ہی ڈھل سکتا ہے۔ شک اور انکار کی اس میں سمائی نہیں۔

قرآن کہتا ہے، یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ وہ نظامِ کائنات کا مطالعہ کرے اور ایک ایسی ہستی کا یقین جو ربّ العلمین ہے اس کے اندر جاگ نہ اٹھے۔ وہ کہتا ہے کہ غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں انسان ہر چیز کا منکر ہو سکتا ہے لیکن اپنی فطرت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کر سکتا ہے لیکن اپنی فطرت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا۔ وہ جب اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر کارخانہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو اُس کی اپنی فطرت اُس کا اندرون صدا دیتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے ضرور کوئی نہ کوئی اس کا بنانے والا اور پیدا کرنے والا بھی ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کا اسلوبِ بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات اور ذہنی مُسلّمات کی شکلیں ترتیب دے اور پھر اُن پر دلیل و برہان کی عمارتیں اٹھائے بلکہ وہ انسان کے فطری وجدان و ذوق سے مخاطب ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے، خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے تو یہ اُس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اُسے غفلت سے چونکا دینے کے لئے دلائل پیش کئے جائیں لیکن یہ دلائل ایسے نہیں ہونے چاہئیں جو محض ذہنی کاوشوں کا مظہر ہوں بلکہ ایسے ہونے چاہئیں جو اُس کے نہاں خانۂ دل پر دستک دیں اور اس کے فطری وجدان کو بیدار کر دیں۔ اگر اُس کا وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثباتِ ایمان کے لئے بحث و دلیل کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی بلکہ خود بخود ایمان کی روح

اُس کے اندر جاگ اٹھے گی یہی وجہ ہے کہ قرآن، خود انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حجت لاتا ہے:۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ط وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ج فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ط فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ج فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ج فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○ (۱۰ : ۳۰)

وہ کون ہے جو آسمان میں (پھیلے ہوئے کارخانۂ حیات) سے اور زمین (کی وسعت میں پیدا ہونے والے سامانِ رزق) سے تمہیں روزی بخش رہا ہے؟ وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمہارا سننا اور دیکھنا ہے؟ وہ کون ہے جو بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور پھر وہ کون سی ہستی ہے جو یہ تمام کارخانۂ خلقت اس نظم و نگرانی کے ساتھ چلا رہی ہے؟ (اے پیغمبر) یقیناً وہ (بے اختیار بول اٹھیں گے) اللہ ہے (اس کے سوا کون ہو سکتا ہے) اچھا تم ان سے کہو جب تمہیں اس بات سے انکار نہیں تو پھر کیوں ایسا ہے کہ غفلت و سرکشی سے نہیں بچتے؟ ہاں بیشک یہ اللہ ہی ہے جو تمہارا پروردگار برحق ہے اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اُسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ (افسوس تمہاری سمجھ پر) تم (حقیقت سے منہ پھرائے) کہاں جا رہے ہو؟

ایک دوسرے موقع پر قرآن پوچھتا ہے:۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ	وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا
الْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ	اور جس نے تمہارے لئے پانی برسایا پھر اس آبپاشی
مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَأَنْۢبَتْنَا	سے خوشنما باغ اگائے حالانکہ تمہارے بس کی یہ بات
بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ	نہ تھی کہ ان باغوں کے درخت اگاتے؛ کیا ان
مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ	کاموں کا کرنے والا، اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ هُمْ	معبود بھی ہے؟ (افسوس ان لوگوں کی سمجھ پر!
قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝ أَمَّنْ	حقیقتِ حال کتنی ہی ظاہر ہو) مگر یہ وہ لوگ ہیں
جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَّ	جن کا شیوہ ہی کج روی ہے اچھا بتلاؤ وہ کون
جَعَلَ خِلٰلَهَآ أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ	ہے جس نے زمین کو زندگی و معیشت کا ٹھکانا
لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ	بنا دیا اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں اس
الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ	کی (درستگی کے لئے) پہاڑ بلند کر دئے اور دریاؤں
اللّٰهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝	میں (یعنی دریا اور سمندر میں) ایسی دیوار حائل
أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا	کر دی (کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں)
دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ	کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس!
يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْأَرْضِ ۗ	کتنی واضح بات ہے) مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ قَلِيْلًا مَّا	ہیں جو نہیں جانتے! اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو
تَذَكَّرُوْنَ ۝ أَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ	بیقرار دلوں کی پکار سنتا ہے جب وہ (ہر طرف
فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ	سے مایوس ہو کر) اسے پکارنے لگتے ہیں اور ان کا
يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ	درد دکھ ٹال دیتا ہے؟ اور وہ کہ اس نے تمہیں

يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ
تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝
اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ
وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ
وَالْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(۲۷: ۶۱: ۶۲)

زمین کا جانشین بنایا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس تمہاری غفلت پر) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو۔ اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے، وہ کون ہے جو بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں چلا دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) اللہ کی ذات اس ساجھے سے پاک و منزہ ہے جو لوگ اس کی معبودیت میں ٹھہرا رہے ہیں۔ اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش شروع کرتا ہے اور پھر اُسے دھراتا ہے اور وہ کون ہے جو آسمان وزمین کے کارخانہائے رزق سے تمہیں روزی دے رہا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ (اے پیغمبر) ان سے کہو اگر تم (اپنے رویّہ میں) سچے ہو (اور انسانی عقل و بصیرت کی اس عالمگیر شہادت کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل ہے) تو اپنی دلیل پیش کرو۔

ان سوالات میں سے ہر سوال اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے کیونکہ ان میں سے

ہر سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ فطرتِ انسانی کا عالمگیر اور مسلّمہ اِذعان ہے۔ قرآن کے وہ بے شمار مقامات جن میں کائناتِ ہستی کے سروسامانِ پرورش اور نظامِ ربوبیت کی کارسازیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دراصل قرآنی استدلال کی بنیاد ہیں اور اسی سے توحیدِ الٰہی کی تائید ہوتی ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ (۸۰: ۲۴: ۳۲)	انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے (جو شب و روز اس کے استعمال میں آتی ہے) ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں پھر اس کی سطح شق کر دیتے ہیں پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اناج کے دانے، انگور کی بیلیں، کھجور کے خوشے، سبزی ترکاری، زیتون کا تیل درختوں کے جھنڈ، قسم قسم کے میوے، طرح طرح کا چارہ (اور یہ سب کچھ کس کے لئے؟) تمہارے فائدے کے لئے اور تمہارے جانوروں کے لئے؟

ان آیات میں "فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ" کے زور پر غور کرو۔ انسان کتنا ہی غافل ہو جائے، اور حقائقِ زندگی سے کتنا ہی اِعراض کرے لیکن دلائلِ حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتیں۔ ایک انسان دنیا کے تمام مظاہر کی طرف سے آنکھیں بند کر لے لیکن اپنی غذا کے ذرائع کی طرف سے بہرحال آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو غذا اُس کے سامنے رکھی ہے اس پر نظر ڈالے، یہ کیا ہے؟

گیہوں کا ایک دانہ! اچھا! گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کے پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام مرحلوں پر غور کرو، کیا یہ ایک حقیر سا دانہ بھی وجود میں آسکتا تھا اگر تمام کارخانۂ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ رہتا؟ اور اگر دنیا میں ایسا باقاعدہ نظام اشتراکیت موجود ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کا ناظم اور کارفرما نہ ہو؟

سورۂ نحل میں یہی استدلال ایک دوسرے پیرایہ میں نمودار ہوا ہے:۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ○ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○	اور (دیکھو یہ) چارپائے (جنھیں تم پالتے ہو) ان میں تمہارے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی بڑی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون و کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لئے بے غل و غش مشروب ہوتا ہے (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو۔ بلاشبہ اس بات میں ارباب عقل کے لئے (ربوبیت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے۔
وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ○	اور (پھر دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس

ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۚ يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝

(۱۶ : ۶۶ : ۶۹)

غرض کے لئے بلند کر دی جاتی ہیں اپنے لئے گھر بنائے پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے پھر اپنے پروردگار کے ٹھیرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرمانبرداری کے ساتھ گامزن ہوئیں۔ (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اس کے شکم سے مختلف رنگتوں کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لئے شفا ہے۔ بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں (ربوبیت الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی) بڑی ہی نشانی ہے۔

جس طرح قرآن نے وجودِ خالق کے ثبوت میں جا بجا خلقت سے استدلال کیا ہے اسی طرح وہ نظامِ حیات اور تخلیقِ کائنات کے احوال سے ربوبیت کا بھی استدلال کرتا ہے یعنی دنیا میں ہر چیز مربوب ہے اس لئے ضروری ہے کہ کوئی رب بھی ہو۔ اور دنیا میں ربوبیت کامل اور بے داغ ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ رب بھی کامل ہو اور بے داغ ہو۔

زیادہ واضح لفظوں میں اسے یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اُسے پرورش کی احتیاج ہے اور اس کی پرورش کے سامان مہیا ہیں پس ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو یہ پرورش کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ یقیناً وہ نہیں ہو سکتا جو خود محتاجِ پرورش ہو، قرآن کی مندرجۂ ذیل آیات اس استدلال پر مبنی ہیں:۔

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝
ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ
ٱلزَّٰرِعُونَ ۝ لَوْ نَشَآءُ
لَجَعَلْنَٰهُ حُطَٰمًا فَظَلْتُمْ
تَفَكَّهُونَ ۝ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ۝
بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝
أَفَرَءَيْتُمُ ٱلْمَآءَ ٱلَّذِى
تَشْرَبُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ
مِنَ ٱلْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنزِلُونَ ۝
لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنَٰهُ أُجَاجًا
فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝ أَفَرَءَيْتُمُ
ٱلنَّارَ ٱلَّتِى تُورُونَ ۝
ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَآ
أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنشِـُٔونَ ۝ نَحْنُ
جَعَلْنَٰهَا تَذْكِرَةً وَمَتَٰعًا
لِّلْمُقْوِينَ ۝ (٥٦: ٦٣ تا ٧٣)

اچھا تم نے اس بات پر غور کیا کہ جو کچھ تم کشت کاری کرتے ہو اُسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اُسے چورا چورا کردیں اور تم صرف یہ کہنے کے لئے رہ جاؤ کہ افسوس! ہمیں تو اس نقصان کا تاوان ہی دینا پڑے گا بلکہ ہم تو اپنی محنت کے سارے فائدوں سے ہی محروم ہوگئے۔ اچھا تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ پانی جو تمہارے پینے میں آتا ہے اِسے کون برساتا ہے؟ اگر ہم چاہیں تو اسے سمندر کے پانی کی طرح کڑوا کردیں، پھر کیا اس نعمت کے لئے ضروری نہیں کہ تم شکر گزار ہو؟ اچھا تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ آگ جو تم سلگاتے ہو تو اس کے لئے لکڑی تم نے پیدا کی یا ہم پیدا کر رہے ہیں؟

ربوبیت۔ وجودِ معاد پر استدلال

اسی طرح وہ 'تخلیق بالحق' سے 'معاد' یا 'حیات بعد الممات' پر بھی استدلال کرتا ہے، یہی وہ منزل ہے جس کی طرف پورا کاروانِ ہستی چلا جا رہا ہے، کیونکہ ممکن ہے،

کہ انسان کو محض اس لئے بنایا گیا ہو کہ وہ چند روز زندہ رہے پھر سر تا سر نیست و نابود ہو جائے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان جو کرۂ ارضی کی بہترین مخلوق ہے اور جس کی جسمانی اور معنوی نشو و نما کے لئے فطرتِ کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے وہ کوئی بہتر استعمال اور بلند تر مقصد نہ رکھتا ہو؟ خالقِ کائنات نے جب ہر چیز کو ایک خاص غرض و غایت کے لئے تخلیق کیا ہے تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بہترین مربوب یعنی انسان کو محض اس لئے بنایا ہو کہ مہمل اور بے نتیجہ چھوڑ دے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ○ (۲۳: ۱۱۵: ۱۱۶)	کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بغیر کسی مقصد و نتیجہ کے پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟ اللہ جو اس کائنات کا حقیقی حکمران ہے اس سے بہت بلند ہے کہ ایک بیکار و عبث فعل کرے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہ جو (جہانداری کے) عرشِ بزرگ کا پروردگار ہے۔
اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ○ (۳۰: ۸)	کیا ان لوگوں نے اپنے دل میں کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے محض بیکار و عبث نہیں بنایا ہے ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لئے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو

اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ
ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے
یک قلم منکر ہیں۔

یہاں تک ہم نے یہ بات اسی سادہ طریقے پر بیان کر دی جو قرآن کے بیان وخطاب کا طریقہ ہے لیکن اسی مطلب کو علمی بحث وگفتگو کے پیرائے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وجودِ انسان کرۂ ارضی کے سلسلۂ خلقت کی آخری اور اعلیٰ ترین کڑی ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ اگر پیدائشِ حیات سے لے کر انسانی وجود کی تکمیل تک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک ناقابلِ شمار مدت کے مسلسل نشوو ارتقا کی تاریخ ہوگی۔ گویا فطرت نے لاکھوں کروڑوں برس کی کارفرمائی وصناعی سے کرۂ ارض پر جو اعلیٰ ترین وجود تیار کیا ہے وہ انسان ہے ماضی کے لئے اس نقطۂ بعید کا تصور کرو، جب ہمارا یہ کُرّہ سورج کے ملتہب کُرّہ سے الگ ہوا تھا۔ نہیں معلوم کتنی مدت اس کے ٹھنڈے اور معتدل ہونے میں گزر گئی اور یہ اس قابل ہوا کہ زندگی کے عناصر اس میں نشوونما پا سکیں اس کے بعد وہ وقت آیا جب اس کی سطح پر نشوونما کی سب سے پہلی داغ بیل پڑی اور پھر نہیں معلوم کتنی مدت کے بعد زندگی کا وہ اوّلین تخم وجود میں آسکا جسے پروٹوپلازم (PROTOPLASM) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے پھر حیاتِ عضوی کی نشوونما کا دور شروع ہوا اور نہیں معلوم کتنی مدت اس پر گذر گئی کہ اس دور نے بسیط سے مرکب تک اور ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی کی منزلیں طے کیں یہاں تک کہ حیوانات کی ابتدائی کڑیاں ظہور میں آئیں اور پھر لاکھوں برس اس میں نکل گئے

کہ یہ سلسلہ وجودِ انسانی تک مرتفع ہوا، پھر انسان کے جسمانی ظہور کے بعد اس کے ذہنی ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوا اور بالآخر ہزاروں برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقا کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہو سکا جو کرۂ ارضی کے تاریخی عہد کا عقیل اور متمدن انسان ہے، گویا زمین کی پیدائش سے لے کر ترقی یافتہ انسان کی تکمیل تک جو کچھ گذر چکا ہے اور جو کچھ بنتا سنورتا رہا ہے وہ تمامتر انسان کی پیدائش و تکمیل ہی کی سرگزشت ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس وجود کی پیدائش کے لئے فطرت نے اس درجہ اہتمام کیا ہے کیا یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ پیدا ہو، کھائے پئے اور مر کر فنا ہو جائے۔ قدرتی طور پر اسی سلسلہ میں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر وجودِ انسانی اپنے ماضی میں ہمیشہ یکے بعد دیگرے متغیر ہوتا اور ترقی کی اعلیٰ تر منزلوں پر پہنچتا رہا ہے تو مستقبل میں بھی یہی ترقی و ارتقاء کیوں جاری نہ رہے؟ اگر اس بات پر ہمیں تعجب نہیں ہوتا کہ ماضی میں بے شمار صورتیں مٹیں اور یکے بعد دیگرے نئی زندگیاں ظہور میں آئیں تو اس بات پر کیوں تعجب ہو کہ انسان کی موجودہ زندگی کا مٹنا بھی بالکل مٹ جانا نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی ایک اعلیٰ تر شکل اور زندگی ہے۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ	کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہوگی؟ کیا اس پر یہ حالت نہیں گذر چکی ہے کہ پیدائش سے پہلے نطفہ تھا پھر نطفہ سے علقہ ہوا یعنی جونک کی شکل ہو گئی، پھر

فَسَوّٰى ۝ (۳۶ : ۷۵) علقہ سے (اس کا ڈیل ڈول) پیدا کیا گیا پھر (اس ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کیا گیا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ (۸۴ : ۱۹) کہ تم کو درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت پر پہنچنا ہے۔

ربوبیت۔ وحی پر استدلال

اسی طرح قرآن نظامِ ربوبیت یا رحمتِ الٰہی کے اعمال سے نیکی اور بدی کے اُن قوانین پر بھی استدلال کرتا ہے جو حیاتِ انسانی میں کار فرما ہیں اور وحی و رسالت کی دلیل بھی پیش کرتا ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ جس رب العالمین نے ہر چیز کی جسمانی نشو و نما کے لئے ایسا نظام قائم کر رکھا ہے کیونکر ممکن ہے کہ اس نے رُوحانی فلاح و سعادت کے لئے کوئی قانون قاعدہ مقرر نہ کیا ہو جس سے انسان کی روحانی ضرورتوں کی تکمیل ہو۔

حٰمٓ ۝ تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ (۴۵ : ۱) یہ اللہ کی طرف سے کتاب (ہدایت) نازل کی جاتی ہے جو عزیز اور حکیم ہے۔

قرآن بیشک اُن لوگوں سے واقف ہے جو وحیٔ الٰہی کے اصول پر شبہ کرتے ہیں۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۝ (۶ : ۹۱) اور اللہ کے کاموں کی انھیں جو قدر شناسی کرنی تھی یقیناً انھوں نے نہیں کیا جب انھوں نے یہ بات کہی کہ اللہ نے اپنے کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔

اس کے لئے قرآن جسمانی دنیا کی تمثیل پیش کرتا ہے کہ جس طرح انسان کی جسمانی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے اسی طرح اس کی روحانی ہدایت کے لئے بھی سروسامان مہیا کیا گیا ہے۔

ربوبیتِ الٰہی خدا کی تخلیقی سرگرمیوں کا ایک مظہر ہے جو اس کی صفتِ رحمت پر دلالت کرتا ہے جس کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات کو اگلے باب میں بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم

صفتِ رحمت

پہلا حصّہ :- رحمتِ الٰہی

ربوبیتِ الٰہی کا نظام، جس پر گزشتہ باب میں روشنی ڈالی گئی ہے زندگی کی ایک جاذبِ توجہ حقیقت ہے لیکن مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائناتِ ہستی کے ہر گوشہ میں ربوبیتِ الٰہی سے بھی زیادہ وسیع حقیقت کارفرما ہے جس پر خود 'ربوبیت' کا انحصار ہے۔ قرآن اُسے رحمت یا رحمانیت یا رحیمیت سے تعبیر کرتا ہے جو ہر مخلوق کو جمال و تکمیل عطا کرتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ :-

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ؕ اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ (۷ : ۱۵۵)

قرآن کی پہلی سورۃ یعنی سورۂ فاتحہ کی دوسری آیت میں رحمت کے تصور کو واضح طور پر پیش کیا گیا ہے بلکہ سورۂ فاتحہ کے سرِعنوان "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ہی میں اس تصوّر کی نقش آرائی کر دی گئی ہے۔ اس میں "الرحمٰن" اور "الرحیم" کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں دونوں کا مادہ رحمت ہے۔ عربی میں "رحمت" کے معنی ہیں ایسی رقّت و نرمی جس سے کسی دوسرے کے لئے شفقت کا اظہار ہو

پس رحمت میں، محبت، شفقت فضل اور احسان سب کا مفہوم داخل ہے۔ "الرحمٰن" کے معنی ہیں جس میں رحمت ہے اور "الرحیم" کا مفہوم ہے ایسی ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے یا ایسی ہستی جس سے کائناتِ خلقت کی ہر شے ہر لمحہ فیضیاب ہوتی رہتی ہے ان دونوں حیثیتوں کو ایک ساتھ واضح کرنے میں قرآن کا مقصد یہ ہے کہ رحمتِ الٰہی کی ہمہ گیری کو واضح کیا جائے۔ ربوبیت کی غایت کائناتِ ہستی کی پرورش ہے لیکن صرف پرورش ہی زندگی کا منتہیٰ نہیں ہے۔ اس پورے کارخانۂ ہستی کی تخلیق بے معنی ہو کر رہ جاتی اگر اس کے ہر عمل میں بتدریج بناؤ اور سنوار کا خاصہ نہ ہوتا۔ فلسفہ کہتا ہے کہ فطرت کا منشا، اور مقتضا یہ ہے کہ وہ بنائے سنوارے اور نکھارے۔ بناؤ کا مزاج اعتدال چاہتا ہے اور حُسن، تناسب کا متقاضی ہوتا ہے اور اعتدال و تناسب دنیا کے تمام تعمیری حقائق کی اصل ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرتِ کائنات میں صرف تعمیر کی ضرورت کیوں ہے؟ محض ہم آہنگی ہی کیوں ہے، انحراف و تجاوز کیوں نہیں؟ فلسفہ ان سوالات کا جواب نہ دے سکا۔ ایک مشہور فلسفی کا قول ہے کہ جس مقام سے "یہ کیوں" شروع ہوتا ہے، فلسفہ کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآن اس کا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ضرورت، رحمتِ الٰہی کی ضرورت ہے، رحمتِ الٰہی چاہتی ہے کہ جو کچھ ظہور میں آئے وہ جمیل و زیبا ہو اور اسی لئے ایسا ہوتا ہے۔ قرآن سوال کرتا ہے:۔

قُل لِّمَن مَّا فِي السَّمٰوٰتِ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کے لئے

وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶ : ۱۲)

ہے؟ (اے پیغمبر!) کہدے اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے لئے ضروری ٹھیرالیا ہے کہ رحمت ہو۔

اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے قرآن کی متعدد آیات پیش کی ہیں جن میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ کائناتِ ہستی کے ہر ذرہ میں حسن و خوبی ہے اور یہ تمام کارگاہِ عالم اسی لئے بنا ہے کہ انسان کو اس سے فائدہ پہنچے اس آیتِ قرآنی میں اسی صداقت کو بیان کیا گیا ہے:-

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۴۵ : ۱۳)

اور آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے (یعنی ان کی قوتیں اور تاثیریں اس طرح تمہارے تصرف میں دے دی گئی ہیں کہ جس طرح چاہو کام لے سکتے ہو) بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس بات میں (معرفتِ حق کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائناتِ ہستی میں رحمتِ الٰہی کا یہ نظام کچھ اس طرح کارفرما ہے کہ بیک وقت ہر مخلوق کو یکساں طور پر نفع پہنچاتا ہے اگر ایک عالیشان محل میں رہنے والا انسان یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تمام کارخانۂ ہستی اسی کی کاربرآریوں کے لئے ہے تو ٹھیک اسی طرح ایک چیونٹی بھی یہ کہہ سکتی ہے کہ فطرت کی ساری کارفرمائیاں صرف اسی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہیں۔ اور کون ہے جو اس بات سے انکار کر سکتا ہے؟ کیا فی الحقیقت

سورج اس لئے نہیں ہے کہ چیونٹی کو حرارت پہنچائے، کیا بارش اس لئے نہیں ہے کہ اُس کے واسطے رطوبت مہیا کرے اور ہوا اس لئے نہیں ہے کہ اس کی ناک تک شکر کی بُو پہنچائے؟ کیا زمین اس کے لئے ہر موسم کے مطابق مقام و پناہ گاہ فراہم نہیں کرتی؟ دراصل فطرت کی بخشائشوں کا قانون کچھ ایسا عام اور ہمہ گیر واقع ہوا ہے کہ بیک وقت ہر مخلوق کو یکساں طور پر فائدہ پہنچاتا ہے:-

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ	اور زمین کے تمام جانور اور (پردار) بازوؤں
وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ	سے اڑنے والے تمام پرند دراصل تمہاری ہی
اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (۶ : ۳۸)	طرح امتیں ہیں۔

تخریب و تعمیر البتہ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ دنیا عالمِ کون و فساد ہے، یہاں ہر بننے کے ساتھ بگڑنا ہے اور ہر بکھرنے کے ساتھ سمٹنا جس طرح سنگ تراش کا پتھر کو توڑنا پھوڑنا اس لئے ہوتا ہے کہ خوبی و دلآویزی کا ایک پیکر تیار کر دے۔ اسی طرح کائناتِ عالم کا تمام بگاڑ بھی اسی لئے ہے کہ بناؤ اور خوبی کا فیضان ظہور میں آئے۔ فطرت اسی نہج سے ہستی کی عمارت کا ایک ایک گوشہ تیار کرتی رہتی ہے۔ وہ پوری احتیاط و توجہ کے ساتھ اس کارخانہ کا ایک ایک کیل پُرزہ ڈھالتی رہتی ہے اور حسن و خوبی کی حفاظت کے لئے ہر رکاوٹ کا مقابلہ اور ہر نقصان کا ازالہ کرتی رہتی ہے۔ تعمیر و تکمیل کی یہی سرگرمیاں ہیں جو بظاہر تخریب و تباہی کی ہولناکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ کارخانہ ہستی میں تخریب

کہاں ہے، جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے وہ تعمیر ہی کا ثبوت ہے۔ سمندروں میں طوفان، دریاؤں میں طغیانیاں، پہاڑوں میں آتش فشانی، جاڑوں میں برفباری، گرمیوں میں بادِ سموم، بارش میں ہنگامۂ ابر و باد و برق و رعد، یہ سب اگرچہ بظاہر خوش آئند نہیں ہوتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر حادثہ، کائناتِ ہستی کی تعمیر و درستگی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جس قدر کوئی مفید سے مفید چیز تمہاری نظر میں ہو سکتی ہے۔ اگر سمندروں میں طوفان نہ اٹھتے تو میدانوں کو بارش کا ایک قطرہ بھی میسر نہ آتا۔ اگر بادلوں میں گرج کڑک نہ ہوتی تو بارانِ رحمت کا فیضان بھی نہ ہوتا۔ اگر آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا لاوا اس کرۂ ارض کی تمام سطح کو پارہ پارہ کر دیتا اور اس کے اوپر پھیل جاتا۔ تم پوچھ بیٹھو گے کہ زمین کے اندر یہ کھولتا ہوا لاوا پیدا ہی کیوں کیا گیا؟ لیکن تمہیں جاننا چاہئے کہ اگر یہ مادہ نہ ہوتا تو زمین کی قوتِ نشو و نما کا ایک ضروری عنصر مفقود ہو جاتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی جانب قرآن نے جا بجا اشارے کئے ہیں۔ مثلاً قرآن کہتا ہے:۔

وَمِنْ آيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۳۰: ۲۴)	اور (دیکھو) اس کی (قدرت و حکمت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ بجلی کی چمک اور کڑک نمودار کرتا ہے اور اس سے تم پر خوف اور امید دونوں کی حالتیں طاری ہو جاتی ہیں نیز وہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پانی کی تاثیر

زمین مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ بلاشبہ
اس صورتِ حال میں ان لوگوں کے لیے جو
عقل و بینش رکھتے ہیں، حکمتِ الٰہی کی بڑی
ہی نشانیاں ہیں۔

جمالِ فطرت قرآن کہتا ہے کہ فطرت کی سب سے بڑی بخشائش اس کا عالمگیر حسن و جمال ہے جو رحمتِ الٰہی کا عکس ہے۔
فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں بلکہ وہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کا ہر نقش نظر افروز ہوتا ہے۔ دراصل کائناتِ ہستی کا مایۂ خمیر ہی حسن و زیبائی ہے، فطرت نے جس طرح اس کے بناؤ کے لئے عناصر پیدا کئے اسی طرح چہرۂ وجود کی آرائش و زیبائش کے لئے روشنی، رنگ، خوشبو اور نغمہ کی تخلیق کی۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲: ۶: ۷)
یہ اللہ ہے، محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا، طاقت والا، رحمت والا، جس نے جو چیز بنائی حسن و خوبی کے ساتھ بنائی۔

بلاشبہ ہم کائناتِ ہستی میں خوبی و دلربائی کے پہلو بہ پہلو زشتی و بدصورتی کے مظاہر بھی پاتے ہیں۔ بلبل کی نغمہ سنجیوں کے ساتھ ساتھ زاغ و زغن کا شور و غوغا بھی ہم سنتے ہیں، سازِ فطرت کے تاروں میں اتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہیں اور کائناتِ ہستی میں تناسب و ہم آہنگی کا یہی قانون کارفرما ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ
ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی بھی اُن

وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ (۱۷ : ۴۲)

میں ہے سب (اپنی بناوٹ کی خوبی اور صفت کے کمال میں) اللہ کی بڑائی اور پاکی کا (زبانِ حال سے) اعتراف کر رہے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ کائناتِ خلقت میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو زبانِ حال سے اس کی تسبیح و تحمید نہ کر رہی ہو مگر (افسوس کہ) تم (اپنے جہل و غفلت سے) اس ترانۂ تسبیح کو سمجھتے نہیں بلاشبہ وہ بڑا ہی بردبار (اور) بڑا ہی بخش دینے والا ہے۔

قرآن کہتا ہے حسن عبارت ہے تناسب و موزونیت سے اور ہر وجود کو یہ خوبی عطا کی گئی ہے اور اس کی ساخت و ترکیب میں کوئی نقص نہیں ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ؕ (۲۳ : ۱۴)

پس کیا ہی بابرکت ذات ہے اللہ کی، بنانے والوں میں سب سے زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ بنانے والا

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ (۶۷ : ۳ : ۴)

اس نے تہ بہ تہہ سات آسمان پیدا کئے تو (خدائے) رحمن کی اس صنعت میں کچھ نقص نہ دیکھے گا۔ پھر آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ (اچھی طرح) دیکھ! (نتیجہ یہ ہوگا کہ) ہر بار نظر ناکام ہو کر اور تھک کر تیرے پاس لوٹ کر آئے گی۔

اس آیت میں "خدائے رحمن کی کاریگری" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر چیز ایک ایسی ہستی کی پیدا کی ہوئی ہے جو صرف خالق نہیں بلکہ ساتھ ہی خدائے رحمت بھی ہے اور جہاں رحمت کی کارفرمائی ہوگی وہاں جمال و تکمیل کی جلوہ گری بھی ہوگی۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ زندگی میں رحمت کی کارفرمائی نہ صرف یہ کہ توحیدِ الٰہی کی شہادت ہے بلکہ وحی اور معاد کا بھی اس سے ثبوت ملتا ہے۔

زندگی کی ہماہمی

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائناتِ ہستی میں جو سرگرمی اور ہماہمی نظر آتی ہے وہ بھی رحمتِ الٰہی کا ایک جلوہ ہے وہ کہتے ہیں کہ کائناتِ ہستی کے ہر میدان اور ہر گوشے میں جہدِ حیات کا جلوہ نظر آتا ہے اور زندگی بحیثیتِ مجموعی ایک آزمائشِ مسلسل ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ ۝ (۹۰ : ۴) — بلاشبہ ہم نے انسان کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کی زندگی مشقتوں سے گھری ہوئی ہے۔

تاہم فطرت نے کارخانۂ معیشت کا ڈھنگ کچھ اس طرح کا بنا دیا ہے اور طبیعتوں میں کچھ اس طرح کے جذبے اور ولولے ودیعت کر دیے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو پورے انہماک کے ساتھ کسی نہ کسی مشغولیت اور سرگرمی میں مصروف رکھتا ہے اور زندگی کا یہی انہماک ہے جس کی بدولت وہ نہ صرف زندگی کی مشقتیں برداشت کرتا ہے بلکہ انھیں مشقتوں سے اپنی راحت و مسرت کے سامان مہیا کر لیتا ہے۔ یہ مشقتیں جتنی زیادہ ہوتی ہیں، زندگی کی دلچسپی اور محبوبیت بھی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ اگر انسان کی زندگی ان آزمائشوں سے خالی ہو جائے تو وہ محسوس کرے گا کہ زندگی کی ساری لذتوں سے محروم ہو گیا ہے

اور اب زندہ رہنا اس کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ مولانا آزاد نے مختلف التنوع انسانی تجربات اور فطرت کے اختلاف و تنوع سے اس بات کا استشہاد کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ بالخصوص قانون تزویج یا اصول تثنیہ یعنی ہر چیز کے دو دو ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور اسے سرگرمیِ حیات کی معاون قوت قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کائناتِ ہستی میں کوئی چیز اکہری اور طاق نہیں پیدا کی گئی ہے۔ ہر چیز میں جفت اور دو ہونے کی قوت کام کر رہی ہے یعنی ہر چیز دوسری چیز سے مِل کر مکمل ہوتی ہے۔ دن کے لئے رات ہے صُبح کے لئے شام ہے، نر کے لئے مادہ ہے، مرد کے لئے عورت ہے اور زندگی کے لئے موت ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (۵۱: ۴۹)

اور ہر چیز میں ہم نے جوڑے پیدا کر دئے (یعنی دو دو اور متقابل اشیا پیدا کیں) تاکہ تم یاد کرو

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۶: ۳۶)

پاکی اور بزرگی ہے اس ذات کے لئے جس نے زمین کی پیداوار میں اور انسان میں اور ان تمام مخلوقات میں جن کا انسان کو علم نہیں دو دو اور متقابل چیزیں پیدا کیں

یہی قانونِ فطرت ہے جس نے مرد اور عورت میں جذب و انجذاب کے ایسے وجدانی احساسات ودیعت کر دئے ہیں کہ اس کی بدولت ازدواجی زندگی کے ضروری تقاضوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ (۴۲: ۱۱)

وہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا، اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس میں سے جوڑے بنا دیئے (یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد) اسی طرح چارپایوں میں بھی جوڑے پیدا کر دیئے۔

قرآن کہتا ہے یہ انتظام اس لئے ہے کہ محبت اور سکون ہو اور دو ہستیوں کی باہمی رفاقت و اشتراک سے زندگی کی محنتیں سہل اور گوارا ہو جائیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۳۰ : ۲۱)

اور (دیکھو) اس کی (رحمت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دئے (یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد) تاکہ اس کی وجہ سے تمہیں سکون حاصل ہو اور پھر (اس کی یہ کارفرمائی دیکھو) تمہارے درمیان (یعنی مرد اور عورت کے درمیان) محبت اور رحمت کا جذبہ پیدا کر دیا بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس میں (حکمتِ الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

بقائے انفع

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائناتِ ہستی کا یہ حسن اور یہ ارتقا زیادہ مدت تک قائم ہی نہیں رہ سکتا تھا اگر اس میں خوبی کی بقا اور خرابی کے ازالے کی قوت سرگرمِ کار نہ رہتی۔ فطرت ہمیشہ فساد اور نقص کو محو کرتی رہتی ہے اور جن چیزوں میں باقی رہنے کی خوبی ہوتی ہے انہیں باقی رکھتی ہے۔ عام اصطلاح میں اسے "بقائے اصلح" سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن قرآن محض اشیاء کے مادی پہلو پر ہی نہیں بلکہ زندگی میں ان کی عام افادیت پر بھی زور دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کارگاہِ ہستی میں وہی چیز باقی رہتی ہے جس میں حیات کے لئے کچھ نہ کچھ افادہ و فیضان ہو۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ

خدا نے آسمان سے پانی برسایا تو ندی نالوں میں جس قدر سمائی تھی اس کے مطابق بہ نکلے اور جس قدر کوڑا کرکٹ

زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (۱۳ : ۱۷)

جھاگ بن کر اُوپر آگیا تھا اُسے سیلاب اٹھا کر بہالے گیا۔ اسی طرح جب زیور یا کسی طرح کا سامان بنانے کے لئے (مختلف قسم کی دھاتیں) آگ میں تپاتے ہیں تو اس میں بھی جھاگ اٹھتا ہے اور میل کچیل کٹ کر نکل جاتی ہے اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کر دیتا ہے جھاگ رائیگاں جائے گا (کیونکہ اس میں نفع نہ تھا) جس چیز میں انسان کے لئے نفع ہوگا وہ زمین میں باقی رہ جائے گی۔

قضا بالحق قرآن کہتا ہے کہ جس طرح کائناتِ ہستی کے مادی نظام میں وہی چیز باقی رہتی ہے جو نافع ہوتی ہے ٹھیک یہی عمل معنویات میں بھی جاری ہے کہ وہی چیز باقی رہے گی جو نفع بخش ہو اس سلسلہ میں قرآن دو اصطلاحات استعمال کرتا ہے "حق" اور "باطل"۔

عربی میں حق کا مادہ "حقق" ہے جس کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات قائم رہنے والی اور اٹل ہو اسے حق کہیں گے اور "باطل" ٹھیک اس کا نقیض ہے یعنی ایسی چیز جس میں ثبات وقیام نہ ہو پس جب کبھی حق اور باطل متقابل ہوں گے تو بقا حق کے لئے ہوگی۔ قرآن اسے "قضا بالحق" سے تعبیر کرتا ہے۔

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷ : ۸۱)

اور کہدو حق نمودار ہوگیا اور باطل نابود ہوا اور یقیناً باطل نابود ہی ہونے والا تھا۔

قرآن میں جہاں کہیں "حق" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو یہ صرف حق کے بقا و ثبات کا دعویٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے جانچنے کا ایک معیار بھی پیش کرتا ہے تاکہ آسانی سے امتیاز

پیدا کیا جا سکے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، کون سی چیز رہنے والی ہے اور کون سی چیز فنا ہونے والی ہے۔ چنانچہ وہ اللہ کی نسبت بھی 'الحق' کی صفت استعمال کرتا ہے اور وحی و تنزیل کو بھی الحق کہتا ہے۔

اگر فطرتِ کائنات زندگی کے لئے کارآمد اور بے کار چیزوں کو چھانٹتی نہ رہتی تو زندگی میں ایک انتشار برپا ہو جاتا اور تمام کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (۲۳ : ۷۱)

اور اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرے تو یقین کرو یہ آسمان و زمین اور جو کوئی اس میں ہے سب درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔

لیکن قضا بالحق کا یہ نتیجہ نہیں ہوتا کہ ہر باطل عمل یا وہ چیز جس میں زندگی کے لئے نفع نہیں ہے لازمی طور پر نابود ہو جائے یا ہر عملِ حق فوراً فتحمند ہو جائے۔ ایسا عمل قانونِ رحمت کے مغائر ہوگا جس طرح مادیات میں تدریج و امہال کا قانون نافذ ہے معنویات میں بھی وہی قانون کارفرما ہے تاکہ ہر نتیجہ کے ظہور اور عمل کی مکافات کے لئے مہلت مل سکے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ دنیا میں کوئی انسانی جماعت اپنی بدعملیوں کے ساتھ مہلتِ حیات پا سکتی۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ط (۱۰ : ۱۲)

اور جس طرح انسان فائدہ کے لئے جلد باز ہوتا ہے اگر اسی طرح اللہ انسان کو سزا دینے میں جلد باز ہوتا تو (انسان کی لغزشوں خطاؤں کا یہ حال ہے کہ) کبھی کا فیصلہ ہو چکتا اور ان کا مقررہ وقت فوراً نمودار ہوتا۔

تدریج و امہال فطرت کے یہ قوانین اس طرح اپنا کام کرتے ہیں کہ کسی حالت میں

بھی فوری اور ڈرامائی انداز میں اچانک تبدیلی رُونما نہیں ہوتی بلکہ بتدریج ان کی نشوونما ہوتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لئے ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ قرآن جہاں یہ کہتا ہے کہ جو بھی (قانونِ حیات) ہم نے نافذ کر دیا ہے اس میں ردّ و بدل ممکن نہیں، وہیں یہ ارشاد بھی فرماتا ہے کہ "ہم اس بنا پر انسان کو کسی نامناسب عذاب میں مبتلا نہیں کرتے" (۲۸ : ۵۱) فطرت نے ہر چیز کے تدریجی عروج و زوال کے لئے ایک خاص مُدت مقرر کر دی ہے جس کا جلوہ صرف حیاتِ انسانی ہی میں نہیں بلکہ ہر تخلیق میں دکھائی دیتا ہے ہر چیز کے لئے ایک خاص وقت یا قرآن کی زبان میں 'اجل' کا تعین کر دیا گیا ہے، جو موجوداتِ ہستی میں سے ہر موجود کے لئے الگ الگ نوعیت رکھتا ہے۔

تدریج و امہال کا یہ قانون خاص طور پر انسانی اعمال کے لئے ہے تاکہ ہر مرحلہ پر وہ توقف و تفکر سے کام لے اور قانونِ فطرت کی مہلت بخشیوں سے فائدہ اُٹھائے چنانچہ توبہ و رجوع کے لئے رحمت کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کارخانۂ حیات میں اگر رحمت نہ ہوتی تو زندگی سے کوئی چیز بھی افادہ و فیضان حاصل نہ کر سکتی اور انسان اپنی بدعملیوں کے ساتھ کبھی زندگی کی سانس نہ لے سکتا۔

لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ۝ (۱۸ : ۵۸)	اگر وہ ان لوگوں سے اُن کے اعمال کے مطابق مواخذہ کرتا تو فوراً عذاب نازل ہو جاتا لیکن اُن کے لئے ایک میعاد مقرر کر دی گئی ہے اور جب وہ نمودار ہوگی تو اس سے بچنے کے لئے کوئی پناہ کی جگہ انھیں نہیں ملے گی۔

عملِ حق اور عملِ باطل، دونوں کے لئے تدریج و امہال کا قانون کام کرتا ہے البتہ
عملِ حق کے لئے تاجیل اس واسطے ہوتی ہے کہ اس کی قوت کو تدریجی طور پر نشوونما
پانے کا موقع ملے اور باطل کے لئے اس واسطے ہوتی ہے کہ اُسے توبہ و رجوع کی
مہلت حاصل ہو سکے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ (۱۷ : ۲۱)

(اے پیغمبر) ہم اِن کو اور اُن کو سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش سے مدد دیتے ہیں اور تمہارے پروردگار کی بخشش کسی پر بند نہیں ہے۔

تاجیل

اگر انسان ان مہلت بخشیوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو وہ اپنے اعمال
کی اصلاح کر سکتا ہے اور آگے بڑھ سکتا ہے اس کے برعکس اگر وہ اِن
مواقع سے فائدہ نہ اٹھائے تو پھر فیصلۂ امر کا آخری وقت آجاتا ہے۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۶ : ۶۱)

سو جب ان کا مقررہ وقت آچکتا ہے تو اُس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر عمل کے نتیجہ کے ظہور کے لئے ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت
مقرر کر دیا گیا ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۝ (۲۱ : ۱۰۹)

پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو ان سے کہہ دو میں نے تم سب کو یکساں طور پر (حقیقتِ حال کی) خبر دے دی اور میں نہیں جانتا، اعمالِ بد کے جن نتائج کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے اس کا وقت قریب ہے یا ابھی دور

لیکن قرآن کہتا ہے کہ تم اپنے اوقات شماری کے پیمانے سے قوانینِ فطرت کی رفتارِ عمل کا اندازہ نہ لگاؤ فطرت کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہے کہ تمہارے معیارِ حساب کی بڑی سی بڑی مدت اس کے لئے ایک دن کی مدت سے زیادہ نہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝

(۲۲ : ۴۷ : ۴۸)

اور یہ لوگ عذاب کے لئے جلد بازی کر رہے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں اگر سچ مچ عذاب آنے والا ہے تو وہ کہاں ہے) سو یقین کرو خدا اپنے وعدہ میں کبھی خلاف کرنے والا نہیں لیکن بات یہ ہے کہ تمہارے پروردگار کا ایک دن ایسا ہوتا ہے جیسے تمہارے حساب کا ہزار برس۔ چنانچہ کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں (عرصۂ دراز تک) ڈھیل دی گئی حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر (جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو) ہمارا مواخذہ نمودار ہوگیا اور (ظاہر ہے کہ) لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے۔

انسان عموماً اپنے اعمال کے فوری نتائج کا متوقع رہتا ہے۔ پیغمبرؐ کے زمانے کے عرب جو اُن کے مخالف و منکر تھے اکثر انھیں یہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اگر وہ گمرہی میں مبتلا ہیں تو انھیں فوراً اس کی سزا ملنی چاہئے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جزاءِ عمل میں تاخیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ توبہ و رجوع کی مہلت باقی رہے اور رحمت کا یہی قانون ہے جو اس کارخانۂ ہستی میں جاری و ساری ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ

اور (اے پیغمبر یہ حقیقت فراموش) کہتے ہیں اگر

إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ۝ (۲۷:۷۱-۷۳)

تم (نتائج ظلم وطغیان سے ڈرانے میں) سچے ہو تو وہ بات کب ہونے والی ہے؟ (اور کیوں نہیں ہو چکتی؟) ان سے کہدو (گھبراؤ نہیں) جس بات کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو عجب نہیں اس کا ایک حصہ بالکل قریب آگیا ہو اور (اے پیغمبرؐ) تمہارا پروردگار انسان کے لئے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے (کہ ہر حال میں اصلاح وتلافی کی مہلت دیتا ہے) لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر) بیشتر ایسے ہیں کہ اُس کے فضل و رحمت سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اس کی ناشکری کرتے ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۚ وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاءَهُمُ الْعَذَابُ ۚ وَلَيَأْتِيَنَّهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (۲۹:۵۳)

اور یہ لوگ عذاب کے لئے جلدی کرتے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں اگر واقعی عذاب آنے والا ہے تو کیوں نہیں آچکتا؟) اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک خاص وقت نہ ٹھیرا دیا گیا ہوتا تو کب کا عذاب آچکا ہوتا اور (یقین رکھو جب وہ آئے گا تو اس طرح آئے گا کہ) یکایک ان پر آگرے گا اور انھیں اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔

وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ ۚ (۱۱:۱۰۴)

اور (یاد رکھو) اگر ہم اس معاملہ میں تاخیر کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ایک حساب کی ہوئی مدت کے لئے اُسے تاخیر میں ڈال دیں۔

قابلِ غور بات یہ نہیں ہے کہ کسی عملِ بد کے نتیجہ کے ظہور میں کتنی مدت لگتی ہے بلکہ قابلِ لحاظ امر یہ ہے کہ آخرِ کار کس قسم کے انسان برومند ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ آخرِ کار وہی انسان برومند ہوتے ہیں جو نیک عمل ہیں۔

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَکُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۶ : ۱۳۷)

(اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے) کہدو کہ دیکھو (اب میرے اور تمہارے معاملہ کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے) تم جو کچھ کر رہے ہو اپنی جگہ کئے جاؤ اور میں بھی اپنی جگہ کام میں لگا ہوں۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کون ہے جس کے لئے آخرِ کار (کامیاب) ٹھکانا ہے۔ بلاشبہ (یہ اس کا قانون ہے کہ) ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

قرآن نے اس اصول کی تبلیغ کی ہے کہ ہر قسم کے فسق و فجور کی ناکامی یقینی ہے اور نیکی و نیک عملی کا برومند ہونا لازمی ہے۔ قرآن نے جہاں جہاں اس اصول کا ذکر کیا ہے، یا اس پر زور دیا ہے اُن تمام مقامات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶ : ۲۱) اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۰ : ۱۷) لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ (۱۰ : ۸۱) اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ (۹ : ۳۸) اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۳ : ۸۶) وغیرہ۔ اس مُعینہ اصول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ارشاد و ہدایت کا دروازہ عمداً ان پر بند کر دیا جاتا ہے اور ان درجوں میں جو انسان آتے ہیں وہ گمراہی کی زندگی پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ قرآن کے مُفسروں نے ان آیات کے مطالب اور قرآن کے اسلوبِ خاص کو سمجھنے میں غلطیاں کی ہیں قرآن کے اِن ارشادات کا مطلب تو یہ ہے کہ اس

امر کے باوجود کہ کارخانۂ حیات میں قانونِ مواخذہ کارفرما ہے، رحمتِ الٰہی انسان کو اصلاحِ حال اور رجوع و انابت کی مہلتیں دیتی ہے لیکن جب ان مہلتوں کو بھی ٹھکرا دیا جاتا ہے یعنی جب گمراہی مُسلط ہو جاتی ہے تو قانونِ مواخذہ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے۔ ان مہلتوں سے فائدہ اٹھانے کو اصطلاحِ قرآنی میں "تمتع" کہا گیا ہے، یہی وہ تمتع ہے جو زندگی کی ہر حالت میں اور ہر انسان کو یکساں طور پر عطا ہوا ہے۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَآبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ (۲۱ : ۴۵)	بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو اور ان کے آباو اجداد کو مہلتِ حیات سے بہرہ مند ہونے کے مواقع دیے یہاں تک کہ (خوشحالی کی) ان پر بڑی بڑی عمریں گذر گئیں۔

اِسی طرح قرآن نے جا بجا مَتَّعْنَا اِلٰی حِیْنٍ (۱۰ : ۹۸) مَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ (۳۶ : ۴۴) فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۱۶ : ۵۵) وغیرہ تعبیرات سے اسی حقیقت پر زور دیا ہے۔

قضا بالحق اور اقوام جس طرح انسانی اعمال میں قضا بالحق یا بقا کا قانون کارفرما ہے اسی طرح قوموں یا جماعتوں کے معاملہ میں بھی اس قانون کی کارفرمائی موجود ہے اور وہ اُن کے عروج و زوال کے حالات کا تعین کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ افراد کی طرح وہ قومیں اور جماعتیں بھی جو زندگی کے لئے غیر نافع ہوتی ہیں، چھانٹ دی جاتی ہیں، صرف وہی اقوام اور جماعتیں باقی رہتی ہیں جو مقصدِ حیات کی ترقی اور نشو و نما کے لئے مفید ہوتی ہیں اور قانونِ رحمت یہی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا میں انسانی ظلم و طغیان کے لئے کوئی روک تھام نہ رہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ

(۲: ۲۵۲)

اور (دیکھو) اگر اللہ (نے جماعتوں اور قوموں میں باہم گر تزاحم پیدا نہ کر دیا ہوتا اور وہ) بعض آدمیوں کے ذریعہ بعض آدمیوں کو راہ سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً زمین میں خرابی پھیل جاتی لیکن اللہ کائنات کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ

(۲۲: ۴۰)

اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ اللہ بعض جماعتوں کے ذریعہ بعض جماعتوں کو ہٹاتا رہتا تو (یقین کرو دنیا میں انسان کے ظلم و فساد کے لئے کوئی روک باقی نہ رہتی اور) یہ تمام خانقاہیں گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اس کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے منہدم ہو کر رہ جاتیں۔

تدریج و امہال اجتماعی زندگی میں

جس طرح فطرتِ کائنات کے تمام کاموں میں تدریج و امہال کا قانون کارفرما ہے اسی طرح قوموں اور جماعتوں میں بھی اس قانون کی کارفرمائی موجود ہے۔ اصلاحِ حال اور رجوع و انابت کا دروازہ ان کے لئے بھی ہمیشہ کھلا رہتا ہے کیونکہ قانونِ رحمت کا مقتضا یہی ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۖ

اور ہم نے ایسا کیا کہ اُن کے لئے الگ الگ گروہ زمین میں پھیل گئے اُن میں سے بعض تو نیک عمل تھے

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (۷:۱۶۸)

بعض دوسری طرح کے پھر ہم نے انھیں اچھائیوں اور برائیوں، دونوں طرح کی حالتوں سے آزمایا تاکہ نافرمانی سے باز آجائیں۔

جس طرح افراد کے لئے راہ راست پر لوٹنے کی ایک خاص مدت معین کر دی ہے اسی طرح اقوام کے لئے بھی، اگر وہ راہِ راست سے بھٹک گئی ہوں تو سیدھے راستے پر واپس آنے کے لئے ایک مدت مقرر کر دی ہے۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○ (۹:۱۲۶)

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان پر کوئی برس ایسا نہیں گزرتا کہ ہم انھیں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ آزمائشوں میں نہ ڈالتے ہوں (یعنی ان کے اعمالِ بد کے نتائج پیش نہ آتے ہوں) پھر بھی نہ تو توبہ کرتے ہیں نہ حالات سے نصیحت پکڑتے ہیں۔

ان تمام مہلتوں کو اگر رائیگاں کر دیا جائے تو پھر قانونِ فطرت کے فیصلہ امر کا آخری وقت نمودار ہو جاتا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۷:۳۴)

اور (دیکھو) ہر امت کے لئے ایک مقررہ وقت ہے سو جب اُن کا مقررہ وقت آچکتا ہے تو اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ○ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ○ (۱۵:۴-۵)

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ (ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون کے مطابق) ایک مقررہ میعاد اس کے لئے موجود تھی کوئی امت نہ تو اپنے مقررہ وقت سے آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

چنانچہ قضا، بالحق کا یہی قانون ناپسندیدہ اور غیر نافع افراد کو چھانٹ دیتا ہے اوران کی جگہ مقصدِ حیات کی تکمیل کے لئے دوسروں کو لا کھڑا کرتا ہے۔

ذَالِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ○ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ الْغَنِىُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ ۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ

(۶ : ۱۳۱: ۱۳۳)

یہ (تبلیغ وہدایت کا تمام سلسلہ) اس لئے ہے کہ تمہارے پروردگار کا یہ شیوہ نہیں کہ بستیوں کو ظلم وستم سے ہلاک کر ڈالے اور بسنے والے حقیقتِ حال سے بے خبر ہوں (اس کا قانون تو یہ ہے) کہ جیسا جس کا عمل ہے اسی کے مطابق اس کا ایک درجہ ہے (اور اسی درجہ کے مطابق اچھے بُرے نتائج ظاہر ہوتے ہیں) اور یاد رکھو جیسے کچھ کسی کے اعمال ہیں تمہارا پروردگار ان سے بے خبر نہیں ہے! تمہارا پروردگار رحمت والا بے نیاز ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں راہ سے ہٹا دے اور تمہارے بعد جسے چاہے تمہارا جانشین بنا دے اسی طرح جس طرح ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اوروں کا جانشین بنا دیا ہے

اِصلاحِ حال اور رجوع وانابت کی مہلت بخشی کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے رحمتِ الٰہی کی حیرت انگیز کارفرمائیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن نے ہر عمل کی جزا وسزا پر زور دیا ہے لیکن ساتھ ہی قرآن کا یہ ارشاد بھی ہے کہ یہ قانون اصلاح ورجوع کے دروازے بند نہیں کرتا۔ توبہ واصلاح کی مہلتوں پہ مہلتیں دی گئی ہیں۔ جوں ہی توبہ وانابت کا احساس انسان کے اندر جنبش میں آتا ہے رحمتِ الٰہی معاً قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اشکِ ندامت کا ایک ایک قطرہ بدعملیوں اور گناہوں کے بے شمار داغ دھبے اس طرح دھو دیتا ہے کہ گویا اس کے دامنِ عمل پر کوئی دھبہ لگا ہی نہ تھا

جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهُ۔ گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کے مانند ہو جاتا ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو

قرآن کہتا ہے:۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ (۱۵ : ۷۰)

ہاں مگر جس کسی نے توبہ کی، ایمان لایا اور آئندہ کے لئے نیک عملی اختیار کی، تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دیتا ہے اور بڑا بخشنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے۔

قرآن نے رحمتِ الٰہی کی وسعت اور اس کی مغفرت و بخشش کی فراوانی کا جو نقشہ کھینچا ہے اوس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ کتنے ہی سخت گناہ ہوں، کیسی ہی شدید اُن کی نوعیت ہو اور کتنی ہی مدت کے گناہ ہوں لیکن ہر اس انسان کے لئے جو اپنے گناہوں پر نادم ہو اور خلوص کے ساتھ اس کے دروازۂ رحمت پر دستک دے، رحمت و قبولیت اُسے اپنے آغوش میں لے لے گی۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (۳۹ : ۵۴)

اے میرے بندو! جنھوں نے (بد عملیاں کر کے) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے (تمہاری بد عملیاں کتنی ہی سخت اور کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، مگر) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقیناً اللہ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا، یقیناً وہ بڑا بخشنے والا، بڑی ہی رحمت رکھنے والا ہے۔

حِصّہ دُوم

صفتِ رحمت اور انسان

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے صفاتِ الٰہی خصوصاً اس کی صفتِ 'رحمت' کی طرف کیوں اس طرح توجہ مبذول کروائی ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ رحمت کی صفت خدا کی وہ صفت ہے جو اس کی تمام صفات پر حاوی ہے اور ہر ایک میں اس کا پرتو پایا جاتا ہے؟ اس کا جواب پیغمبرؐ نے ایک حدیث قدسی میں یوں دیا ہے کہ:-

تم اپنے اندر صفاتِ الٰہی پیدا کرو۔

اور چونکہ رحمت ایک عالمگیر صفتِ الٰہی ہے اس لئے انسان کی اوّلین غایت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اپنے فکر و عمل کے ہر شعبہ میں چاہے وہ سماجی ہو یا معاشی ہو یا سیاسی، اس عظیم صفت کی جھلک پیدا کرے۔

خدا اور بندے کے درمیان رشتہ محبت قرآن نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ	اور (دیکھو) انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے ہیں جو دوسری ہستیوں کو اللہ کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں، وہ

كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (۲ : ۱٦۵)

انھیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں جس طرح اللہ کو چاہنا ہوتا ہے حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کے لئے ہوتی ہے

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ الرَّحِيْمٌ ○ (۳ : ۳۱)

(اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہدو اگر واقعی تم اللہ سے محبت رکھنے والے ہو تو چاہئے کہ میری پیروی کرو۔ (میں تمہیں محبتِ الٰہی کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو (صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اللہ سے محبت کرنے والے ہو جاؤ گے بلکہ خود) اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔

قرآن جا بجا اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ (۵ : ۵۹)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین کی راہ سے پھر جائے گا تو (وہ یہ نہ سمجھے کہ دعوتِ حق کو اس سے کچھ نقصان پہنچے گا) عنقریب اللہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا کرے گا جنھیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہوں گے۔

قرآن کہتا ہے محبتِ الٰہی کی راہ اُس کی مخلوق کی محبت میں سے ہو کر گذرتی ہے، جو انسان چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے اُسے چاہئے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔

وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (۲ : ۱۷۷)

اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں نکالتے اور خرچ کرتے ہیں۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ (۷۶ : ۸ : ۹)

اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں، قیدیوں کو کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہمارا یہ کھلانا اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ کے لئے ہے ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ کسی طرح کی شکر گذاری۔

ایک حدیث قدسی میں یہی حقیقت نہایت مؤثر پیرایہ میں بیان کی گئی ہے

ان الله تعالیٰ يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَا ابْنَ آدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِيْ قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ اَعُوْدُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ عَبْدِيْ فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ اَمَا عَلِمْتَ اِنَّكَ لَوْ عُدْتَهٗ لَوَجَدْتَنِيْ عِنْدَهٗ يَا ابْنَ آدَمَ اِسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِيْ قَالَ يَا رَبِّ وَكَيْفَ اُطْعِمُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّهُ اِسْتَطْعَمَكَ عَبْدِيْ فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ اَطْعَمْ

(قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہے گا) اے ابن آدم! میں بیمار ہوگیا تھا مگر تونے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ متعجب ہوکر کہے گا بھلا ایسا کیونکر ہوسکتا ہے اور تو تو رب العلمین ہے۔ خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہوگیا تھا اور تونے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائے گا" اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تونے نہیں کھلایا، بندہ عرض کریگا بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا

لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ یَا ابْنَ آدَمَ اِسْتَسْقَیْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِیْ قَالَ یَا رَبِّ وَكَیْفَ اَسْقِیْكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ قَالَ اِسْتَسْقَاكَ عَبْدِیْ فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهٖ اَمَا اِنَّكَ لَوْ سَقَیْتَهٗ لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ۔

(اَخْرَجَهٗ مُسْلِمٌ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ)

اور تونے انکار کر دیا تھا اگر تو اِسے کھلاتا تو تُو اُسے میرے پاس پاتا'، ایسے ہی خدا فرمائے گا اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے مجھے پانی نہ پلایا، بندہ عرض کرے گا بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے، تو تُو خود پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اُسے پانی نہ پلایا۔ اگر تُو اُسے پانی پلا دیتا تو تُو مجھے اُس کے پاس پاتا۔

اعمال وعبادات

اسی طرح قرآن نے اعمال وعبادات کی جو شکل ولوعیت قرار دی ہے، اخلاق وخصائل میں سے جن جن باتوں پر زور دیا ہے اور اوامر ونواہی ہیں جو جو اُصول ومبادی ملحوظ رکھے ہیں ان سب میں بھی یہی حقیقت کام کر رہی ہے، قرآن نے خدا کی کسی صفت کو بھی اس کثرت کے ساتھ نہیں دُہرایا ہے اور نہ کوئی مطلب اس درجہ اس کے صفات میں نمایاں ہے جس قدر رحمت کا ذکر ہے۔ اگر قرآن کے وہ تمام مقامات جمع کئے جائیں جہاں 'رحمت' کا ذکر کیا گیا ہے تو ایسے مقامات تین سو سے زیادہ ہوں گے اور اگر وہ تمام مقامات بھی شامل کر لئے جائیں جہاں اگرچہ لفظ 'رحمت' استعمال نہیں ہوا ہے لیکن اُن کا تعلق رحمت ہی سے ہے جیسے ربوبیت، مغفرت رافت، کرم، حِلم، عفو وغیرہ، تو پھر یہ تعداد اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ کہا جا سکتا ہے قرآن اول سے لے کر آخر تک اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمتِ الٰہی کا پیام ہے پیغمبرِ اسلام نے اپنے قول وعمل سے جو حقیقت ہم پر واضح کی ہے وہ تمام تر

یہی ہے کہ خدا کی موحدانہ پرستش اور اس کے بندوں پر شفقت و رحمت کی جائے ایک مشہور حدیث ہمیں بتلاتی ہے کہ:۔

اِنَّمَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مِنْ عِبَادِہِ الرُّحَمَاءَ۔ — خدا کی رحمت انھیں بندوں کے لئے ہے جو اس کے بندوں کے لئے رحمت رکھتے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا مشہور کلمۂ وعظ کہ "زمین پر رحم کرو تاکہ وہ جو آسمان پر ہے تم پر رحم کرے"۔ بجنسہٖ پیغمبر اسلام کی زبان پر بھی طاری ہوا۔

اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ، یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ" ایک سے زیادہ حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ اللہ کی رحمت رحم کرنے والوں کے لئے ہے۔ اگرچہ یہ رحم ایک حقیر چڑیا ہی کے لئے کیوں نہ ہو!

اصل یہ ہے کہ قرآن نے خدا پرستی کی بنیاد ہی اس جذبہ پر رکھی ہے کہ انسان اپنے قول و عمل میں خدا کی صفتوں کا پرتو پیدا کرے، وہ انسان کے وجود کو ایک ایسی سرحد قرار دیتا ہے جہاں حیوانیت کا درجہ ختم ہوتا اور ایک مافوق حیوانیت کا درجہ شروع ہو جاتا ہے، انسان کا جوہر انسانیت جو اُسے حیوانیت کی سطح سے بلند و ممتاز کرتا ہے اور جو اُسے اشرف المخلوقات کے مرتبہ تک پہنچا دیتا ہے قرآن اُسے خدا کی رُوح پھونک دینے سے تعبیر کرتا ہے۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ط (۳۲ : ۸) — یعنی خدا نے آدم میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دیا اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے اندر عقل و حواس کا چراغ روشن ہو گیا۔

اوپر کی آیت سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ کائناتِ ہستی میں انسان کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ خدا نے خود اپنی روح اُس میں پھونک دی، یعنی انسان کو عقل و حواس کی زندگی میں رحمت کی کارفرمائی کے لئے یہ جوہر ودیعت کیا گیا۔

پس قرآن جہاں جہاں خدا کی رحمت کا تصور ہمارے دماغ میں پیدا کرنا چاہتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ وہ چاہتا ہے ہم بھی اپنے اندر رحمت و ربوبیت کی ساری کیفیت پیدا کر لیں، خدا کی دوسری صفات کو پیش کرنے کا مدعا بھی یہی ہے۔ جس بات پر قرآن سب سے زیادہ زور دیتا ہے وہ بخشش و درگذر ہے، قرآن کی یہ تعلیم اس کا اصل اصول ہے۔ بلا شبہ اس نے یہ نہیں کہا کہ اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرو لیکن اس نے یہ ضرور کہا کہ دشمنوں کو بھی بخش دو۔ جو دشمن کو بخش دینا سیکھ جائے گا وہ خود بھی خدا کی بخشش کا مستحق ہو جائے گا۔ اپنے نفس کو آلودگیوں سے پاک و صاف کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

اَلْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۳ : ۱۳۴)	غصہ ضبط کرنے والے اور انسانوں کے قصور بخش دینے والے اور اللہ کی محبت انھیں کے لئے ہے جو احسان کرنے والے ہیں۔
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۙ (۱۳ : ۲۲)	اور جن لوگوں نے اللہ کی محبت میں (تلخی و ناگواری) برداشت کر لی، نماز قائم کی، خدا کی دی ہوئی روزی پوشیدہ و علانیہ (اس کے بندوں کے لئے) خرچ کی اور برائی کا جواب برائی سے نہیں نیکی سے دیا۔ تو (یقین کرو) یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے۔

قرآن نے بدلہ لینے سے بالکل روک نہیں دیا ہے لیکن جہاں کہیں بھی اس نے اس کی اجازت دی ہے صرف تحفظِ حیات کے لئے دی ہے اور پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ جہاں کہیں وہ انتقام کی اجازت دیتا ہے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ عفو و بخشش ایک بہتر طریقہ ہے اور بدی کے بدلے میں نیکی کرنا تمہارے لئے زیادہ

اچھا ہے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ (۱۶ : ۱۲۶)

اور (دیکھو) اگر تم بدلہ لو تو چاہئے جتنی اور جیسی کچھ برائی تمہارے ساتھ کی گئی ہے اسی کے مطابق ٹھیک ٹھیک بدلہ بھی لیا جائے (یہ نہ ہو کہ زیادتی کر بیٹھو) لیکن اگر تم برداشت کر جاؤ اور بدلہ نہ لو تو (یاد رکھو) برداشت کرنے والوں کے لئے برداشت کر جانے میں ہی بہتری ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ (۴۲ : ۴۰)

اور برائی کے لئے ویسا ہی اور اتنا ہی بدلہ ہے جیسی اور جتنی برائی کی گئی ہے لیکن جس کسی نے درگذر کیا اور معاملہ کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

انجیل اور قرآن

ہم نے ابھی یہ بیان کیا ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ "اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرو" یہ بیان کچھ اور تشریح چاہتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھا چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جا بجا اس طرح کے خطابات پاتے ہیں:-

"تم نے سنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا کہ دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ لیکن میں کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ لیکن اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہئے دوسرا گال بھی آگے کر دو۔"

"تم نے سنا ہوگا اگلوں سے کہا گیا اپنے ہمسایوں سے پیار کرو اور اپنے دشمن سے نفرت لیکن میں کہتا ہوں اپنے ہمسایوں سے پیار کرو اور جو تم پر

لعنت بھیجتے ہیں اُن پر رحمت بھیجو اور جو تم سے نفرت کرتے ہیں اُن سے نیکی کرو اور اُن کے لئے دعائے مغفرت کرو جو تمہارے ساتھ بیرحمی سے پیش آتے ہیں اور تمہیں ہلاک کرتے ہیں۔"

لیکن سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ روحانی فضائل و اخلاق کا پیام تھا یا تشریع یعنی قوانین وضع کرنا تھا؟

دعوتِ مسیح کی فراموشی مولانا آزاد اس امر پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ انجیل کے پیرو اور اس کے نکتہ چین دونوں یہاں مختلف قسم کی غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے اور مسیح علیہ السلام کے ان خطابات کو ایک قطعی ضابطۂ اخلاق سمجھ بیٹھے تاہم آخر کار انھیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود پیروانِ مسیح نے اپنے آپ کو اس بات سے تسلی دے لی کہ اگرچہ یہ احکام ناقابلِ عمل ہیں لیکن چند مسیحوں ولیوں اور شہیدوں نے بہرحال ان پر عمل کر لیا تھا، دوسری طرف نکتہ چینوں نے کہا کہ یہ سرتاسر ایک نظری اور ناقابلِ عمل تعلیم ہے۔ عملی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور یہ فطرتِ انسانی کے صریح مغائر ہے ۔۔۔ درحقیقت نوعِ انسانی کی یہ بڑی ہی دردانگیز ناانصافی ہے جو تاریخ انسانیت کے اس عظیم الشان معلّم کے ساتھ جائز رکھی گئی۔ جس طرح بیدرد نکتہ چینوں نے اُسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم و بصیرت سے انکار کر دیا۔ کیا مسیحؑ کا پیام واقعی ناقابلِ عمل تھا؛ کیا وہ فطرتِ انسانی کے مغائر تھا؟ ایسا تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم بنیادی طور پر اس قرآنی تعلیم کو ضرب لگا رہے ہیں کہ دنیا کے تمام پیغمبروں کا پیام ایک ہی ہے۔

دعوتِ مسیحؑ کی حقیقت اصل یہ ہے کہ پیروانِ مسیحؑ نے تعلیماتِ مسیحؑ کی

حقیقت کو سمجھنے میں کوتاہی کی۔ حضرت مسیحؑ کا ظہور تاریخ کے ایک ایسے عہد میں ہوا تھا جبکہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کے بجائے محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش، دینداری و خداپرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جتنی متمدن اقوام قرب و جوار میں موجود تھیں مثلاً رومی، مصری، آشوری، وہ بھی کم و بیش اسی حالتِ زوال سے گذر رہی تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگوں نے یہ نہیں جانا کہ مسیحؑ کا پیام رافت و محبت اور عفو و بخشش اور جرم و گناہ کی مروجہ زندگی سے باز رکھنے کے لئے تھا۔ اس زمانے میں انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو بلا وجہ جلا کر خاکستر بنا دینا، اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت اور بے رحمی پر فخر کرنا رومی تمدن کا اخلاق اور مصری اور آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔ ضرورت تھی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو جو سرتاسر رحمت و محبت کا پیام ہو اور انسان کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام توجہ مبذول کر دے چنانچہ حضرت مسیحؑ کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہوئی، جس نے جسم کی جگہ روح پر زبان کی جگہ دل پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوعِ انسانی کو توجہ دلائی، اور محبت و انسانیت کا فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا۔

حضرت مسیحؑ کا الہامی کلام مجازات کی قدرتی تاثیر کا حامل تھا لیکن اقانیم ثلاثہ اور کفارہ جیسے دور از کار عقائد پیدا کرنے والے اُن کے مواعظ کا مقصد و محل اور اُن کے مجازات کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے اور اُن کی سرتاسر

لفظی تاویلات میں پڑ کر گمراہ ہو گئے۔

حضرت مسیح نے جہاں کہیں یہ کہا ہے کہ 'اپنے دشمن سے پیار کرو' تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہیے کہ اپنے دشمنوں کا عاشقِ زار ہو جائے بلکہ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ تھا کہ تم میں غیض و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحمت و محبت کا پُرجوش جذبہ ہونا چاہیے۔ ایسے گردوپیش میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی نفرت کا برتاؤ کیا جاتا ہو یہ کہنا کہ 'اپنے دشمنوں سے پیار کرو' یقیناً نفرت و غضب سے کنارہ کش ہونے کا ایک کامل ترین جذبہ پیدا کر سکتا تھا یا مثلاً اگر انھوں نے کہا تھا "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو" تو یقیناً مسیح کے ذہن میں اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ تم اپنا دوسرا گال آگے کر دیا کرو بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ اپنے اندر عفو و درگذر کا جذبہ پیدا کرو۔ ہر بلیغ کلام کے لفظی معنی لینا شائستہ ذہن کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو ان کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں تو نہ صرف تمام الہامی تعلیمات ہی درہم و برہم ہو جائیں گی بلکہ انسان کا وہ تمام کلام جو الہام و بلاغت کا مرقع ہے یک قلم مختل ہو جائے گا۔

بلاشبہ مذاہب و قوانین نے جرم و گناہ کے لئے تعزیر و عقوبت کا حکم دیا ہے کیونکہ انسانی معیشت کے لئے یہ ناگزیر ہے لیکن تعزیر و عقوبت کا مُدعا صرف یہ ہوتا ہے یا صرف اس لئے اسے گوارا کیا جاتا ہے کہ بڑے درجہ کی برائیوں کو روکنے کے لئے ایک کم درجہ کی برائی کو برداشت کر لیا جائے۔ خالص مذہبی نقطۂ نظر سے تعزیر و عقوبت کی غایت اس سے زیادہ نہیں لیکن دنیا نے اسے انسان کی تعذیب و ہلاکت کا ایک خوفناک آلہ بنا لیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی

قتل و غارتگری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو۔ اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ جنگ و جدال کو چھوڑ کر انسانی ہلاکت و بربادی کی سب سے بڑی قوتیں کون کون سی رہی ہیں تو یقیناً اس کی انگلیاں اُن عدالت گاہوں کی طرف اٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے نام سے قائم کی گئیں اور جنھوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل جاری رکھا۔ حضرت مسیحؑ کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ نفسِ تعزیر و سزا کے خلاف کوئی نئی تشریع کریں —— بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ انسان میں عفو و محبت کے جذبات کو موجزن کر دیں، وہ بتلانا چاہتے تھے کہ اعمالِ انسانی میں اصل رحم و محبت ہے اور عقوبت و انتقام ایک آخری شکل اور ایک ناگزیر علاج ہے۔

شریعت موسوی کے پیرووں نے شریعت کو صرف سزا دینے کا آلہ بنالیا تھا حضرت مسیحؑ نے بتلایا کہ شریعت سزا دینے کے لئے نہیں بلکہ نجات کی راہ دکھانے آتی ہے اور نجات کی راہ سرتاسر رحمت و محبت کی راہ ہے۔

عمل اور عامل

دراصل اس بارے میں انسان کی بنیادی غلطی یہ رہی ہے کہ وہ "عمل" اور "عامل" میں امتیاز قائم نہیں رکھتا۔ مذہب اس فرق و امتیاز کو واضح طور پر پیش کرتا ہے، تمام مذاہب کا یہ مقصد رہا ہے کہ بدعملی اور گناہ کے عمل کی طرف سے انسان کے دل میں نفرت پیدا کی جائے لیکن یہ انھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ خود انسان کی طرف سے انسان کے اندر نفرت پیدا ہو جائے یقیناً انھوں نے زور دیا ہے کہ گناہ سے نفرت کرو لیکن یہ کبھی نہیں کہا ہے کہ گنہگار سے نفرت کرو۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک طبیب ہمیشہ لوگوں کو بیماریوں سے ڈراتا رہتا ہے اور اُن کے مہلک نتائج کا ہولناک نقشہ پیش کرتا رہتا ہے لیکن یہ تو وہ کبھی نہیں کرتا کہ جو لوگ

بیمار ہو جائیں اُن سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگے بلکہ اس کی تو ساری توجہ اور شفقت کا مرکز بیماری کا وجود ہوتا ہے اور جو انسان جتنا زیادہ بیمار ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کی توجہ اور شفقت کا مرکز بن جائے گا۔ اور یہی شیوہ رُوح و دل کے طبیبوں کا بھی ہوتا ہے۔ وہ گنہگار سے نفرت نہیں کرتے بلکہ اُس کے لئے سراپا رحمت و شفقت بن جاتے ہیں، وہ یقیناً یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں گناہوں سے نفرت پیدا کر دیں، گنہگار انسانوں سے نہیں اور فرق و امتیاز کا یہی وہ نازک مقام ہے جہاں بڑے بڑے پیروانِ مذہب نے ٹھوکر کھائی ہے، حضرت مسیح کی تعلیم سرتاسر اسی حقیقت پر مبنی تھی کہ گناہوں سے نفرت کرو مگر اُن انسانوں سے نفرت نہ کرو جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں بلکہ اُن کے ساتھ لطف و رافت کا برتاؤ کرو تاکہ وہ اپنے ماضی کے گناہوں کی تلافی کر سکیں اور انسانی زندگی کے لئے دوبارہ ایک متاعِ عزیز بن جائیں۔ بعض ائمہ تابعین نے اسی حقیقت کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کیا ہے "اِنْکِسَارُ الْعَاصِیْنَ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ صَوْلَۃِ الْمُطِیْعِیْنَ"۔ "خدا کو فرمانبردار بندوں کی تمکنت سے کہیں زیادہ گنہگار بندوں کا عجز و انکسار محبوب ہے۔" اور پھر یہی حقیقت ہے کہ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں جہاں کہیں خدا نے گنہگار انسانوں کو مخاطب کیا ہے تو عموماً یائے نسبت کے ساتھ کیا ہے جو تشریف و محبت پر دلالت کرتی ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ (۳۹ : ۵۳) — (اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں کو) کہدو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے۔

یا

ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ (۲۵ : ۱۸) — کیا تم نے میرے بندوں کو گمراہ کیا تھا؟

اس طرزِ تخاطب کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک باپ جوشِ محبت میں بیٹے کو پکارتا ہے۔ "اے میرے فرزند! اے میرے فرزند!" پیغمبرؐ کے پڑنواسے حضرت امام جعفر صادقؑ نے سورۂ زمر کی آیۂ رحمت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے "جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف وخطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں کیونکہ سمجھ جاتے ہیں، ہم ان پر غضبناک نہیں۔" قرآن میں خدا نے بیس سے زیادہ موقعوں پر "یٰعِبَادِیَ" کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے اور سخت سے سخت گنہگار انسان کو بھی "یٰعِبَادِیَ" کہہ کر پکارا ہے، کیا اس سے بھی بڑھ کر اس کی رحمت و آمرزش کا کوئی پیام ہو سکتا ہے؟

انجیل اور قرآن کی تعلیمات میں کوئی اختلاف نہیں

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ فی الحقیقت حضرت مسیح کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں، دونوں کا معیارِ احکام ایک ہی ہے، فرق صرف محلِ بیان اور پیرایۂ بیان کا ہے۔ حضرت مسیح نے صرف تزکیۂ قلب پر زور دیا اور کوئی نئی شریعت نہیں پیش کی کیونکہ شریعتِ موسوی موجود تھی اور وہ اس میں تبدیلی کرنا نہیں چاہتے تھے، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ اس شریعت کو تزکیۂ قلب کے لئے استعمال کیا جائے لیکن قرآن بیک وقت اخلاق اور قانون دونوں کے احکام بیان کرتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس نے ایک ایسا اسلوب اور پیرایۂ بیان اختیار کیا جو مجازات اور تشابہات کی جگہ احکام و قوانین کا صاف صاف چچا تلا پیرایۂ بیان تھا۔ اس نے سب سے پہلے عفو و درگذر پر زور دیا اور اسے نیکی اور فضیلت کی اصل قرار دیا، دوسرے یہ کہ ناگزیر صورتوں میں بدلہ

لینے اور سزا دینے کا دروازہ بھی کھلا رکھا اور تیسرے یہ کہ نہایت واضح اور قطعی لفظوں میں اُس نے کہدیا کہ بدلے اور سزا میں زیادتی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ وہ ناانصافی ہوگی۔ تمام مذاہب کا ماحصل یہی تین اصول رہے ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ؕ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

(۴۲ : ۴۳)

اور (دیکھو) بُرائی کے بدلے ویسی ہی اور اتنی ہی برائی ہے لیکن جو کوئی بخش دے اور بگاڑنے کی جگہ سنوارے تو (یقین کرو) اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو زیادتی کرنے والے ہیں۔ اور جس کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور وہ ظلم کے بعد اس کا بدلہ لے تو اس پر کوئی الزام نہیں۔ الزام ان لوگوں پر ہے جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق ملک میں فساد کا باعث ہوتے ہیں سو یہی لوگ ہیں جن کے لئے عذابِ الیم ہے۔ اور جو کوئی بدلہ لینے کے بجائے برائی برداشت کر جائے اور بخش دے تو یقیناً یہ بڑی ہی اولوالعزمی کی بات ہے۔

غور کرو! عفو و درگذر پر پورا زور دیا گیا ہے، اگرچہ انتقام و سزا کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے لیکن بتا دیا گیا ہے کہ نیکی و فضیلت کی راہ دراصل عفو و درگذر ہی کی راہ ہے۔ پھر اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ قرآن نے اسی سزا کو جو برائی کے بدلے میں دی جائے "برائی" ہی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی "سیّئۃ" کے بدلے میں جو کچھ کیا جائے گا وہ بھی "سیئۃ کے مانند" ہی ہوگا۔ بیشک برائی کبھی نیکی نہیں بن سکتی لیکن سزا کا دروازہ اس لئے کھلا رکھا گیا ہے کہ کہیں

زیادہ بڑی برائیاں ظہور میں نہ آنے لگیں، پھر اس آدمی کی نسبت جو معاف کردے "اصلح" کا لفظ کہا ہے یعنی "سنوارنے والا" اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کے اصلی سنوارنے والے وہی ہوئے جو عفو و درگذر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

ممکن ہے یہاں یہ خدشہ محسوس کیا جائے کہ اگر فی الحقیقت قرآن کی تعلیم کا اصلِ اصول رحمت ہی ہے تو پھر اس نے اپنے مخالفوں کی نسبت سخت پیرایہ کیوں اختیار کیا؟ اس کا مفصل جواب تو اپنے محل پر آئے گا لیکن یہاں اس سلسلہ میں ایک مختصر اشارہ کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ قرآن میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اس نے ان لوگوں کے لئے جنھوں نے پیغمبر اسلام کے زمانے میں قرآنی تعلیم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، بہت سخت پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کن مخالفوں کے لئے؟ اُن کے لئے جن کی مخالفت محض اختلافِ فکر و عقائد کی مخالفت تھی؟ یا ان کے لئے جن کی مخالفت نے جارحانہ معاندت کی شکل اختیار کرلی تھی؟ قرآن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قرآن نے جہاں کہیں بھی مخالفوں کا ذکر کرتے ہوئے سختی کا اظہار کیا ہے وہ وہی مخالفین ہیں جنھوں نے قرآن پر ایمان لانے والوں کو عمداً ہلاک کیا اور ان کے ساتھ جارحانہ عناد و شرارت کا سلوک کیا۔ ایسے مخالفوں کے ساتھ بھی نرمی و شفقت کا برتاؤ انسانیت کی بدخدمتی کے مترادف ہوتا۔ یہ ایک ایسی رحمت ہوتی جو ظلم و فساد اور شرارت و ناانصافی کی پرورش کرنے والی ہوتی۔ قرآن نے صفاتِ الٰہی میں رحمت کے ساتھ عدالت کو بھی جگہ دی ہے جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔ قرآن رحمت کو عدالت سے علیحدہ نہیں کرتا بلکہ اُسے عینِ رحمت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم انسانیت کے ساتھ

رحم و محبت کا برتاؤ کر ہی نہیں سکتے اگر ظلم و شرارت کے لئے تم میں سختی نہیں ہے۔ انجیل میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح بھی اپنے زمانے میں مفسدوں کو "سانپ کے بچے" اور "ڈاکوؤں کی ٹولی" کہنے پر مجبور ہوئے۔

کفرِ محض اور کفرِ جارحانہ

قرآن نے کفر کا لفظ انکار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ انکار دو طرح کا ہوتا ہے ایک انکارِ محض ایک انکارِ جارحانہ۔ کفرِ محض یا انکارِ محض کئی شکلیں اختیار کرسکتا ہے، ایک شخص تمہاری تعلیم قبول نہیں کرتا اس لئے کہ وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی یا اس میں طلبِ صادق نہیں ہے یا اس لئے کہ جس راستے پر وہ چل رہا ہے اُسی پر قانع ہے، یہ کفرِ محض ہے۔ اس کے لئے قرآن کہتا ہے' اے پیغمبر کہدے! لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ "(تمہارے لئے تمہارا راستہ اور میرے لئے میرا راستہ) لیکن جارحانہ انکار، انکارِ محض سے مختلف ہوتا ہے، جارحانہ انکار سے مقصود وہ حالت ہے جو صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں تمہارے خلاف ایک طرح کی کد پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے مخالف اپنی پوری قوت کے ساتھ تمہاری ہلاکت و بربادی کے درپے ہو جائیں گے اور تم کتنی ہی سچی بات کہو وہ تمہیں جھٹلائیں گے اور تمہیں چین نہیں لینے دیں گے۔ اسی نوعیت کے مخالفین کی نسبت قرآن ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے جو سخت معلوم ہوتا ہے۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ	ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہو گئے ہیں جیسے چارپائے نہیں بلکہ چارپایوں سے

بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (۷: ۱۷۹) بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ بلا شبہ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوب گئے۔

بنی نوع انسان کی تاریخ میں جب کبھی سچائی کی کوئی دعوت ظاہر ہوئی ہے تو کچھ لوگوں نے اُسے قبول کر لیا ہے کچھ نے انکار کیا لیکن کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے عمداً پوری شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی ہے قرآن کو اِن تینوں قسم کی انسانی جماعتوں سے عہدہ برآ ہونا تھا اُس نے پہلی جماعت کو اپنی آغوشِ تربیت میں لے لیا، دوسری جماعت کو اپنا پیام سنایا اور اس پر غور و خوض کرنے کی مہلت دی اور کہا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ۔ لیکن تیسری جماعت کے ساتھ وہ زجر و توبیخ سے پیش آیا۔ اگر ایسی جماعت کے لئے بھی قرآن لطف و رحمت کا لب و لہجہ اختیار کرتا تو اس کا مطلب جارحانہ قول و عمل کے آگے جھک جانے کے ہوتے اور یہ چیز قانونِ فطرت کے خلاف ہوتی رحمت ہمیشہ عدالت کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ کائناتِ فطرت میں یہ عام قانون کارفرما ہے جس کی پابندی دنیائے انسانیت کے لئے بھی ضروری ہے۔

باب چہارم

خدا کی صفتِ عدل

ربوبیت اور رحمت کے بعد قرآن میں خدا کی جس صفت کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس کی صفتِ عدل ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے وقت جزا کا جو اعتقاد تھا قرآن اُسے رد کرتا ہے، وہ جزا کو انسان کے اعمال کا ناگزیر نتیجہ اور مکافات قرار دیتا ہے، جزا کا قدیم عقیدہ مطلق العنان بادشاہوں کی شاہیت اور الوہیت سے اخذ کردہ تھا اسی کی مشابہت میں لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ خدا بھی مطلق العنان بادشاہوں کی طرح من مانے انعام و اکرام اور سزائیں دینے لگتا ہے اسی واسطے اس زمانہ کے لوگ دیوتاؤں کا جوشِ غضب ٹھنڈا کرنے کے لئے طرح طرح کے قربانیاں کرتے اور ان کی نظرِ التفات حاصل کرنے کے لئے نذریں چڑھاتے تھے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا تصورِ الٰہ دیوبانی تصور سے قدرے بلند ہو گیا تھا لیکن پرانے زمانہ کے عام تصور کی بنیادی خصوصیت بدستور باقی تھی، یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ دوسروں کے دیوتاؤں کی طرح خدا ایک مطلق العنان بادشاہ تھا جو اُن سے خوش ہوتا تو اسرائیل کے خدا کی حیثیت اختیار کر لیتا اور ناخوش ہوتا تو جوشِ انتقام میں آ کر اُن کی بربادی و ہلاکت کا سبب بن جاتا۔ عیسائیوں کا اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے

اس کی پوری نسل مغضوب ہو گئی اور جب تک خدا نے اپنی صفتِ ابنیت کو بشکلِ مسیح قربان نہیں کر دیا اُس کے نسلی گناہ اور مغضوبیت کا کفارہ نہ ہو سکا۔

لیکن قرآن نے جزا و سزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل و نوعیت کا پیش کیا ہے۔ وہ اُسے خدا کا کوئی ایسا فعل قرار نہیں دیتا جو کائناتِ ہستی کے عام قوانین و نظام سے الگ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک عالمگیر قانونِ مکافاتِ عمل پیرا ہے۔ کائناتِ ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے۔ فکر احساس یا عمل کی شکل میں ہر شے کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے اور اپنے اچھے یا بُرے اثرات مترتب کرتی ہے اور اسی کا نام جزا و سزا یا عذاب و ثواب ہے۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے۔ اسی طرح بُرے عمل کا نتیجہ بُرائی ہے اور یہ عذاب ہے۔ ایک کو بہشت سے اور دوسرے کو دوزخ سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی ایک مخصوص فطرت رکھتی ہے اور یہی حال انسانی اعمال کا بھی ہے۔ ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے اور اسی کو قرآن جزا و سزا، عذاب و ثواب یا عدالت کہتا ہے:

أَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئٰتِ أَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۚ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم انھیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ دونوں برابر ہو جائیں۔ زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ (اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا یہی فیصلہ ہے تو) افسوس اُن کے فیصلے پر! اور اللہ نے آسمان و زمین کو بیکار و عبث نہیں بنایا ہے۔ اور اس لئے

بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۴۵ : ۲۱ : ۲۲)

بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ ملے۔ اور یہ بدلہ ٹھیک ٹھیک ملے گا۔ کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر اچھے اور برے عمل کو "کسب" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ عربی میں کسب کے لفظی معنی ہیں "ایسا کام جس کے نتیجہ سے تم کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہو"۔ یعنی کسب کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے لئے جزا و سزا خود انسان ہی کی کمائی ہے۔ قرآن نے سورۂ بقرہ میں جزا و سزا کا قاعدۂ کلیہ بتلا دیا ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ (۲ : ۲۸۶)

ہر انسان کے لئے وہی ہے جیسی کچھ اس کی کمائی ہوگی جو کچھ اسے پانا ہے وہ بھی اس کی کمائی سے ہے اور جس کے لئے اسے جوابدہ ہونا ہے وہ بھی اس کی کمائی سے ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ○ (۴۱ : ۴۶)

جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لئے کیا اور جس کسی نے برائی کی تو خود اسی کے آگے آئے گی اور ایسا نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے لئے ظلم کرنے والا ہو۔

اسی اصول کا اطلاق قوموں اور جماعتوں پر بھی ہوتا ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۲ : ۱۳۴)

یہ ایک امت تھی جو گذر چکی۔ اس کے لئے وہ نتیجہ تھا جو اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہ نتیجہ ہے جو تم کماؤ گے۔

ایک مشہور حدیث قدسی میں اسی اصولِ حیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:-

يَا عِبَادِي لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا زَادَ فِي مُلْكِي شَيْئًا۔ يَا عِبَادِي لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا نَقَصَ ذَالِكَ مِنْ مُلْكِي شَيْئًا۔ يَا عِبَادِي لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ قَامُوا فِي صَعِيدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلُونِي فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ مَا نَقَصَ ذَالِكَ مِمَّا عِنْدِي إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا دَخَلَ الْبَحْرَ۔ يَا عِبَادِي إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيهَا لَكُمْ ثُمَّ أُوَفِّيكُمْ إِيَّاهَا فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذَالِكَ فَلَا يَلُومَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ (مسلم عن ابی ذرؓ)

اے میرو بندو! اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گذر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح نیک ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے تو یاد رکھو اس سے میری خداوندی میں کچھ اضافہ نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گذر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح بدکار ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ بدکار رہے تو اس سے میری خداوندی میں کچھ نقصان نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گذر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر انسان کو اس کی منہ مانگی مراد بخش دیتا تو میری رحمت و بخشش کے خزانے میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی جتنی کمی سوئی کے ناکے کے جتنا پانی نکل جانے سے سمندر میں ہو سکتی ہے۔ اے میرے بندو! یاد رکھو یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنھیں میں تمہارے لئے انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں اور پھر انھیں کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمہیں اپس

دے دیتا ہوں۔ پس جو کوئی تم میں اچھائی پائے
چاہئے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے اور جس کسی کو
برائی پیش آئے تو چاہئے کہ خود اپنے وجود کے
سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے۔

یہاں یہ خدشہ کسی کے دل میں واقع نہ ہو کہ جزا و سزا محض خدا کی خوشنودی یا ناراضی کا نتیجہ ہے۔ ارشادِ قرآنی یہ ہے کہ جزا و سزا تمام تر انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے اور خدا نیک عمل سے خوش ہوتا ہے اور بد عمل سے ناراض ہوتا ہے یہ تصور اس کے پہلے کے معتقدات کا نقیض ہے۔ بہر حال جزا و سزا کے اس قانون کے لئے 'الدین' کی اصطلاح نہایت موزوں ہے اور اُن تمام غلط تصورات کا خاتمہ کر دیتی ہے جو اس بارے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سورۂ فاتحہ میں اِس کے استعمال نے نیکی اور بُرائی سے پیدا ہونے والے نتائج یعنی جزا و سزا کی اصلی حقیقت آشکار کر دی ہے۔

اور پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن نے ربوبیت اور رحمت کے بعد خدا کی صفتِ قہر و جلال میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا ہے بخلاف ازیں وہ خدا کو "مالك یوم الدین" بیان کرتا ہے جس سے ربوبیت اور رحمت دونوں صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے اُس میں قہر و غضب کے لئے کوئی جگہ نہیں البتہ عدل ضرور ہے اور صفاتِ قہریہ جس قدر بیان کی گئی ہیں دراصل اسی کے مظاہر ہیں جو نبی نوعِ انسان کی بہتری کے لئے کام کرتی رہتی ہیں۔

فی الحقیقت صفاتِ الٰہی کے تصور کا یہی وہ مقام ہے جہاں فکرِ انسانی

نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی۔ اُس نے کائناتِ ہستی کے تمام ناخوشگوار واقعات کو خدا کی ناراضامندی کا مظہر قرار دے دیا اور قہر و غضب کی صفات کو صفاتِ الٰہی پر محمول کر لیا۔ حالانکہ اگر وہ فطرتِ کائنات کی حقیقت کو قریب سے دیکھتا تو معلوم کر لیتا کہ جن مظاہر کو وہ خدا کے قہر و غضب پر محمول کر رہا ہے وہ عین مقتضائے رحمت ہیں۔ اگر فطرتِ کائنات میں قانونِ مکافات جاری و ساری نہ ہوتا یا مدارجِ تکمیل طے کرنے کے لئے راستہ کے حائلات دور نہ کئے جاتے تو میزانِ عدل قائم نہ رہتا اور تمام نظامِ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

جس طرح کارخانۂ خلقت اپنے وجود و بقا کے لئے خدا کی ربوبیت اور رحمت کا محتاج ہے اُسی طرح اپنی تکمیل کے لئے اُس کے عدل کا بھی محتاج ہے ربوبیت اور رحمت زندگی کے لئے افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے اور عدل سے بناؤ و خوبی ظہور میں آتی ہے اور نقصان و فساد کا ازالہ ہوتا ہے۔ اگر تم کائناتِ خلقت کے اس پہلو کا بہ نظرِ غور مشاہدہ کرو تو دیکھو گے کہ یہاں خوبی و جمال اور بناؤ و سلجھاؤ میں سے جو کچھ ہے وہ سب کچھ قوتِ عدل کا ظہور ہے۔

عربی میں معدلت یا عدل کے معنی برابر ہونا' عدالت کا کام دو فریقوں کی باہمدگر زیادتیوں کو دور کر دینا ہوتا ہے' ترازو کے تول کو بھی عدل یا معدلت کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں پڑلوں کا وزن برابر کر دیتا ہے۔ معدلت زندگی میں تناسب پیدا کر دیتی ہے اور ایک جز کو دوسرے جز کے برابر لا کر اتحاد یا ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہی قانون ہے جو زندگی اور فکر کے ہر اسلوب میں حسن و تناسب کا نکھار پیدا کرتا ہے۔ کارخانۂ ہستی کا سارا نظام ہی عدل و توازن پر قائم ہے۔ نظامِ شمسی کا ہر کرہ اور ہر ستارہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص نظامِ توازن میں جکڑا ہوا اپنے اپنے دائروں میں

حرکت کر رہا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو نظامِ معاشرت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ساکت ہو جائے تو تمام نظامِ عالم مختل ہو کر رہ جائے۔

قرآن ہم سے یہ غور کرنے کا مطالبہ کرتا ہے کہ جب یہ اصولِ نصفت کائناتِ خلقت کے ہر گوشے میں نافذ ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال وافکار اس کے اثر سے خارج ہو جائیں؟ اسی لئے اس پورے عملِ توازن و تناسب کو جو زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے، قرآن "عملِ صالح" کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بد عملی یا برائی کے لئے جتنی تعبیرات اختیار کی ہیں سب ایسی ہی ہیں کہ اگر اُن کے معانی پر غور کیا جائے تو عدل و توازن کی ضِد اور مخالف ثابت ہوں گی۔ مثلاً ظلم، طغیان، اِسراف، تبذیر، افساد، اِعتدا اور عُدوان وغیرہ جسے ہم ظلم کہتے ہیں، عربی میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جو بات جس جگہ ہونی چاہئے وہاں نہ ہو یا بے محل ہو، اسی لئے قرآن نے شرک کو "ظلم عظیم" کہا ہے کیونکہ اس سے زیادہ کوئی بے محل بات نہیں ہو سکتی اور یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا بے محل ہونا یا اپنی صحیح جگہ پر نہ ہونا ایک ایسی حالت ہے جو حقیقتِ عدل کے عین منافی ہے۔ اسی طرح طغیان کے معنے ہیں، کسی چیز کا اپنی حد سے گذر جانا، جب دریا کا پانی اپنی حد سے بلند ہو جاتا ہے تو "طغیان" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ حد سے تجاوز، توازن اور عدل کے منافی ہے۔ اسراف (فضول خرچی) تبذیر (غلط استعمال) اور افساد (شرارت وفساد) بھی اِسی شعبہ میں آتے ہیں، اعتدا اور عدوان دونوں کے معنی "حد سے گزر جانے" کے ہیں پس ہر وہ شے جو بے محل ہو، تعمیر و تکمیل کے راستے کی رکاوٹ ہے جس کو راستے سے ہٹا دینا چاہئے اور عدل یہی کام انجام دیتا ہے جو قرآن کے الفاظ میں خدا کی رحمت یا رحمانیت کا اظہار ہے۔

بابِ پنجم

وحدتِ دین

جزا و سزا کا قانون جس کا گذشتہ باب میں ذکر ہوا ہے، انسانی ذمہ داریوں کے سوال سے بحث کرتا ہے ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے، عذاب و ثواب انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ربوبیتِ الٰہی، جس کا مقصد کائناتِ ہستی کی پرورش اور نشو و نما ہے، انسان کو یہ صلاحیت عطا کرتی ہے کہ وہ یقین و اطمینان کے ساتھ اپنی اُن ذمہ داریوں کو پورا کر سکے جس سے زندگی میں سابقہ پڑتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر کیا انسان میں اس بات کی استعداد ہوتی ہے اور کیا اُسے ایسے مواقع ملتے ہیں کہ وہ اپنے لئے وہ راہِ عمل انتخاب کر سکے جو اس کو مطلوبہ بھلائی کی طرف لیجائے تاکہ اس کے اعمال و افعال پر جزا و سزا کے قانون کو حق بجانب قرار دیا جا سکے؟ قرآن اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے:۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۙ وَ اَلَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۙ — وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر اُسے درست کیا پھر ایک اندازہ ٹھیرا دیا پھر اس کی راہ (عمل) کھول دی۔ (۸۷ : ۲)

اس آیت میں تکوینِ وجود کے جو مرتبے بیان کئے گئے ہیں، وہ تخلیق، تسویہ، تقدیر و ہدایت کے مرتبے ہیں۔ ارشادِ قرآنی ہے کہ جس طرح خدا کی ربوبیت نے

ہر وجود کو اس کا جامۂ ہستی عطا فرمایا اُس کے ظاہری و باطنی قویٰ درست کئے اور اُس کے اعمال کے لئے ایک مناسبِ حال اندازہ ٹھیرا دیا اُسی طرح اُس کی ہدایت کا بھی ہر و سامان کر دیا:۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰ : ۵۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہِ عمل کھول دی۔

پھر قرآن نے ہدایت کے بھی چار مرتبے بیان کئے ہیں، وجدان، حواس عقل اور وحی و نبوت، ہدایت کے پہلے دو مرتبے انسان اور حیوان سب کے لئے ہیں لیکن تیسرا مرتبہ یعنی مرتبۂ عقل انسان کے لئے خاص ہے، لیکن یہ سب مرتبے اپنا محدود دائرۂ عمل رکھتے ہیں، جہاں وجدان کی ہدایت ختم ہو جاتی ہے حواس کی ہدایت رہبری کرنے کے لئے آجاتی ہے اور اسی طرح جب حواس کی ہدایت اپنی حد تک پہنچ جاتی ہے تو عقل کی ہدایت دستگیری کرتی ہے لیکن عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ اسی لئے ضروری تھا جیسا کہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے خدا کی ربوبیت اور رحمت کے ساتھ ایک چوتھے مرتبہ ہدایت کا بھی سامان کر دیا جائے، یہی مرتبۂ ہدایت ہے جسے قرآن وحی و نبوت کی ہدایت سے تعبیر کرتا ہے:۔

قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی ؕ (۲ : ۱۲۰)

(اے پیغمبر!) اُن سے کہدو اللہ کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو "الھدیٰ" ہے (یعنی ہدایت کی حقیقی اور عالمگیر راہ)

یہ "اَلْھُدیٰ" کی اصطلاح ہے جس کے ذریعہ خدائی ہدایت کا اظہار کیا گیا ہے اس کا مطلب ہے ہدایت کی ایک ہی حقیقی راہ۔ اِسی عالمگیر ہدایتِ وحی

کو قرآن نے "اَلدِّین" اور "الاِسلام" کے نام بھی دیئے ہیں یعنی خدا کے بنائے ہوئے قوانینِ حیات کو تسلیم کرنے کا راستہ۔

وحدتِ دین

قرآنی تعلیم کا اصلِ اصول یہی وحدتِ دین ہے جو ہمیشہ ایک ہی رہی ہے لیکن مولانا آزاد کہتے ہیں کہ تاریخِ عالم کے عجائبِ تصرفات میں سے یہ واقعہ بھی سمجھنا چاہئے کہ جس درجہ قرآن نے اس اصل پر زور دیا تھا اُتنا ہی زیادہ دنیا کی نگاہوں نے اُس سے اعراض کیا، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی کوئی اور صداقت دنیا کی نظروں سے اسقدر پوشیدہ نہیں ہے جس قدر کہ یہ اصلِ عظیم۔ اگر ایک شخص ہر طرح کے خارجی اثرات سے خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے اور اُس میں جا بجا اس اصلِ عظیم کے قطعی اور واضح اعلانات پڑھے اور پھر دنیا کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے تو وہ حیران ہو کر رہ جائے گا کہ ان قطعی اعلانات کے باوجود قرآن کی حقیقت کو بھی بہت سی مذہبی گروہ بندیوں کی طرح ایک مذہبی گروہ بندی کی حیثیت دیدی گئی ہے۔

اس حقیقت کی توضیح کے لئے مولانا آزاد نے ضروری سمجھا کہ تفصیل کے ساتھ اس بات پر روشنی ڈالی جائے کہ جہاں تک وحیٔ نبوت کا تعلق ہے قرآن کی دعوت کیا ہے اور وہ کس راہ کی طرف نوعِ انسانی کو لیجانا چاہتی ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ اس باب میں قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ:۔ ابتداء میں نسلِ انسانی ایک قوم کی طرح رہتی اور قدرتی زندگی بسر کرتی تھی بعد میں چل کر کثرت اور ضروریاتِ معیشت کے دباؤ کے باعث طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے اور جمعیتِ انسانی مختلف گروہوں میں بٹ گئی اور ہر گروہ دوسرے سے نفرت کرنے لگا، جب یہ صورتِ حال پیدا

ہوگئی تو ضروری ہوا کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے عدل و صداقت کی روشنی نمودار ہو تاکہ وہ پھر متحد ہو سکیں۔ چنانچہ خدا کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم ہوگیا اور نوعِ انسانی کو اتحاد و یگانگت کی تعلیم دینے کے لئے یکے بعد دیگرے خدا کے نبیوں کا ظہور ہونے لگا، انسانیت کے ان محسنوں کو خدا "رسل" (واحد رسول) یا پیغمبر کے لقب سے یاد کرتا ہے کیونکہ وہ بنی نوعِ انسان کو خدا کی سچائی کا پیام پہنچانے والے تھے ان تمام پیغمبروں کا پیام ایک ہی تھا اور کسی خاص گروہ یا ملک یا قوم کے لئے مخصوص نہ تھا۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں نسلِ انسانی آباد ہوئی ہو اور خدا کا کوئی رسول مبعوث نہ ہوا ہو۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ (۱۳ : ۸)

قرآن کہتا ہے کہ کتنے ہی پیغمبر یکے بعد دیگرے مبعوث ہوئے جنھوں نے قوموں کو پیغامِ حق پہنچایا، ان میں سے بعض کا نام قرآن میں لیا گیا ہے اور بعض کا نہیں۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ (۴۳ : ۵)

اور کتنے ہی نبی ہیں جو ہم نے پہلوں میں (یعنی ابتدائی عہد کی قوموں میں) مبعوث کئے!

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (۱۷ : ۱۶)

اور (ہمارا قانون یہ ہے کہ) جب تک ہم ایک پیغمبر مبعوث کر کے راہِ ہدایت نہ دکھا دیں اس وقت تک (پاداشِ عمل میں) عذاب دینے والے نہیں!

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (۴۰ : ۷۸)

اور (اے پیغمبر) ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی پیغمبر مبعوث کئے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں سنائے ہیں، کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سنائے (یعنی قرآن میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا)

ہر عہد میں خدا کا راستہ ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ وہ کسی حال میں بدل نہیں سکتا پس بنی نوعِ انسان کے لئے اس کی ہدایت بھی اول دن سے ایک ہی طرح کی ہے اور یہ ہدایت کیا تھی؟ صرف یہ کہ خدائے واحد پر ایمان لاؤ اور نیک عملی کی زندگی بسر کرو۔ ہر عہد میں اور ہر قوم کے لئے خدا نے دین کا یہی ایک راستہ بتایا۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ج (۱۶ : ۳۸)

اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا (جس کی تعلیم یہ تھی) اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے (یعنی سرکش اور شریر قوتوں کے اغوا سے) اجتناب کرو۔

قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی بانیِ مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لئے ہے۔ پس اس غرض کے لئے ایک پروردگارِ عالم کی بندگی میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی محبت اور یک جہتی کی راہ اختیار کرو۔

وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ (۲۳ : ۵۲)

اور (دیکھو) یہ تمہاری امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں پس (میری عبودیت و نیاز کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ اور) نافرمانی سے بچو۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ

اور (دیکھو) اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ قرار دی ہے جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا حکم ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ کو

وَمُوْسٰی وَعِیْسٰی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ (۴۲ : ۱۳)

دیا تھا) ان سب کی تعلیم یہی تھی کہ "الدین" (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر الہامی کتاب نے خدا کی راہ پر چلنے کی تعلیم دی ہے۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱ : ۲۴ : ۲۵)

(اے پیغمبر!) ان سے کہہ دو (اگر تمہیں میری تعلیم سے انکار ہے تو) اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ تعلیم موجود ہے جس پر میرے ساتھی یقین رکھتے ہیں اور اسی طرح وہ تمام تعلیمیں بھی موجود ہیں جو مجھ سے پہلے قوموں کو دی گئیں (تم ثابت کر دکھاؤ کسی نے بھی میری تعلیم کے خلاف تعلیم دی ہو) اصل یہ ہے کہ (ان منکرین حق) میں اکثر آدمی ایسے ہیں جنھیں سرے سے امرِ حق کی خبر ہی نہیں اور اس لئے حقیقت کی طرف سے گردن موڑے ہوئے ہیں

(اے پیغمبر! یقین کر) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر بھی ایسا نہیں بھیجا جسے اس بات کے سوا کوئی دوسری بات بتلائی گئی ہو کہ "میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو!

اتنا ہی نہیں بلکہ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ ہر پیغمبر کی تعلیم دوسرے پیغمبر کی تعلیم کی تصدیق کرتی ہے کیونکہ سب کی تعلیم ایک ہی تھی۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ

(اے پیغمبر!) اللہ نے تم پر یہ کتاب سچائی کے ساتھ

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرَاۃَ وَالْاِنْجِیْلَ ۙ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ (۳ : ۲)

نازل کی ہے جو اُن کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور اسی طرح لوگوں کی ہدایت کے لیے اس نے تورات اور انجیل نازل کی تھی۔

الدین اور الشّرع

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وحی الٰہی نے ایک ہی اصولِ زندگی کی تعلیم دی ہے، ایک ہی اصل اور قانون کی تعلیم دی ہے، تو پھر مذاہب میں اختلاف کیوں پیدا ہوا اور تمام مذہبوں میں ایک ہی طرح کے احکام، ایک ہی طرح کے رسوم وظواہر کیوں نہ ہوئے؟

قرآن کہتا ہے مذاہب کا اختلاف دو طرح کا ہے ایک اختلاف تو وہ ہے جو پیروانِ مذاہب نے مذہب کی حقیقی تعلیم سے منحرف ہو کر پیدا کر لیا ہے۔

دوسرا اختلاف وہ ہے جو مذہبی تعلیم کے نفاذ و اطلاق میں پایا جاتا ہے مثلاً ایک مذہب میں عبادت کی کوئی خاص شکل مقرر کی گئی ہے، دوسرے میں کوئی دوسری شکل، تو یہ اختلاف دین کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اس کی تعلیم کے اطلاق یعنی شرع کا اختلاف ہے اس لئے دین اور شرع میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ دین میں کسی قسم کا انحراف قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ ہر عہد اور قوم کے لئے وہ ایک ہی ہوتا ہے لیکن انسانی جمعیت کے احوال و ظروف ہر عہد میں بدلتے رہتے ہیں، پس ہر زمانے کے مزاج اور اس دور کے لوگوں کی استعداد و طبیعت کے مطابق شرع و منہاج کی شکل میں بھی تبدیلی ضرور ہوتی رہی اور جب تک خدا کی توحید اور نیک عملی کے بنیادی راستے میں اس کی وجہ سے انحراف نہیں ہوتا اس میں کوئی قباحت نہیں۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲۲ : ۶۶)

(اے پیغمبر!) ہم نے ہر گروہ کے لئے عبادت کا ایک خاص طور طریقہ ٹھیرا دیا ہے جس پر وہ چلتا ہے۔ پس لوگوں کو چاہئے اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف دعوت دو۔ یقیناً تم ہدایت کے سیدھے راستے پر گامزن ہو۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۲ : ۱۴۸)

اور (دیکھو) ہر گروہ کے لئے کوئی نہ کوئی سمت ہے جس کی طرف عبادت کرتے ہوئے وہ اپنا منھ کرلیتا ہے پس (اس معاملہ کو اسقدر طول نہ دو) نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو (کہ اصلی کام یہی ہے) تم کسی جگہ بھی ہو اللہ تم سب کو پالے گا۔ یقیناً اللہ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔

اِن آیتوں پر نظر ڈالنے سے دین اور منہاج یا شریعت کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔ دین عبارت ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی سے اور شرع نام ہے اس اصول کو روبہ عمل لانے کا اور اس کو جانچنے کا معیار اچھائیوں کے نتائج و نوعیت پر منحصر ہوتا ہے۔ دین کے حقیقی عناصر کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

(اور دیکھو) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منھ پورب کی طرف اور پچھم کی طرف کرلیا یا اس طرح کی کوئی دوسری بات ظاہری رسم اور

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (۲ : ۱۷۷)

ڈھنگ کی کرلی) نیکی کی راہ تو اُس کی راہ ہے جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، ملائکہ پر، تمام کتابوں پر، اور تمام نبیوں پر ایمان لاتا ہے، اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیتا ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں خرچ کرتا ہے، نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے، قول و قرار کا پکا ہوتا ہے، تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت، ہر حال میں ثابت قدم رہتا ہے۔ (سو یاد رکھو) ایسے ہی لوگ ہیں جو (اپنی دینداری میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو برائیوں سے بچنے والے ہیں۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ تیرہ سو برس سے زیادہ سے قرآن میں یہ آیت موجود ہے اس کے باوجود، اگر قرآن کی دعوت کے اصل مقصد کو دنیا اب تک نہیں سمجھ سکی ہے تو بلا شبہ یہ قرآن کا قصور نہیں ہے۔

دین کی وحدت کو فراموش کر دیا گیا جب قرآن کا ظہور ہوا تو حال یہ تھا کہ تمام مروجہ مذاہب کے پیرو مذہب کو صرف اُس کے رسوم و ظواہر ہی میں دیکھتے تھے اور مذہبی اعتقاد کا تمام جوش و خروش اسی قسم کی باتوں میں سمٹ گیا تھا، ہر گروہ کا یہ ایمان تھا کہ دوسرا گروہ نجات سے محروم رہے گا۔ محض اس بناء پر کہ دوسرے کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں لیکن

قرآن کہتا ہے کہ نہیں یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل ہیں اور نہ سچائی کی کسوٹی بلکہ یہ دین کا محض ایک ظاہری ڈھانچہ ہیں، روح و حقیقت اِن سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے۔ یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسانی کی مشترکہ میراث ہے۔ اعمال و رسوم کی حیثیت فروعی ہے جو وقتاً فوقتاً بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے قرآن کہتا ہے تم میں سے ہر جماعت کے لئے ہم نے ایک قانون (شرع) اور ایک کھلا راستہ (منہاج) ٹھیرا دیا ہے، یہاں 'دین' کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے کیونکہ دین تو سب کے لئے ایک ہی ہے۔ اس میں انحراف و تنوع نہیں ہو سکتا البتہ شرع و منہاج قدرتی طور پر سب کے لئے یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں کہیں قرآن نے اس چیز پر زور دیا ہے کہ — "اگر خدا چاہتا تو تمام انسان ایک ہی راہ پر جمع ہو جاتے یا ایک ہی قوم بن جاتے" وہ اس بات کو لوگوں کے دلوں میں اتار دینا چاہتا ہے کہ مختلف ملکوں میں رہنے والی مختلف اقوام کے مختلف گروہوں میں فکر و عمل کا اختلاف موجود ہے اور یہ طبیعتِ بشری کا قدرتی خاصہ ہے، پس اس اختلاف کو حق و باطل کا معیار اور انسانی گروہوں کی باہمی نفرت و عداوت کا موجب نہیں بننا چاہیے البتہ مذہب کی اصل بنیاد یعنی ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کو اس سے نقصان نہ پہنچنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تحمل و رواداری پر بہت زور دیا ہے یہاں تک کہ جو لوگ اُس کی دعوتِ توحید کے خلاف جبر و تشدد

کام لے رہے تھے اُن کی طرف سے بھی اُسے معذرت کرنے میں تامل نہیں۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۶ : ۱۰۸)

اور (دیکھو) جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں تم ان پر سب وشتم نہ کرو کیونکہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ لوگ بھی ازراہِ جہل و نادانی خدا کو بُرا بھلا کہنے لگیں گے (یاد رکھو) ہم نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ کو اپنا ہی عمل اچھا دکھائی دیتا ہے۔ پھر بالآخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے اور وہیں ہر گروہ پر اس کے اعمال کی حیثیت کھلنے والی ہے۔

ایک موقع پر خود پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۰ : ۹۹)

اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو زمین میں جتنے انسان ہیں سب ایمان لے آتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے) پھر کیا تم چاہتے ہو لوگوں کو مجبور کر دو کہ مومن ہو جائیں۔

تجدیدِ دعوت

ایسی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام مذاہب کی اصل ایک ہی ہے اور سب کی بنیاد سچائی پر ہے تو پھر ظہورِ قرآن کی ضرورت کیا تھی؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے کہ گو تمام مذاہب سچے ہیں لیکن تمام مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ سب کو اُن کی گمشدہ سچائی پر از سرِ نو جمع کر دیا جائے اور قرآن کا یہی کام ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ سچائی اور دین سے پیروانِ مذاہب کی گمراہیاں اعتقادی

اور عملی دونوں طرح کی تھیں اور ان گمراہیوں نے مختلف شکلیں اختیار کرلی تھیں۔ ایک سب سے بڑی گمراہی جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اُسے "تشیّع" اور "تحزّب" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنے ہیں الگ الگ جتھے بنالینا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ	جن لوگوں نے اپنے ایک ہی دین کے ٹکڑے ٹکڑے
كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ	کر دئیے اور الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ گئے
شَيْءٍ ؕ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ	تمہیں اُن سے کوئی واسطہ نہیں اُن کا معاملہ خدا
ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝	کے حوالے ہے جیسے کچھ ان کے عمل رہے ہیں اس کا
(۶ : ۱۵۸)	نتیجہ خدا انہیں بتلا دے گا۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ	پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر جدا جدا
زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ	دین بنا لئے۔ ہر ٹولی کے پلّے جو کچھ پڑ گیا ہے اسی
فَرِحُوْنَ (۲۳ : ۵۳)	میں مگن ہے۔

تشیّع تشیّع اور تحزّب کے الفاظ کہاں سے آئے اسے پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ خدا کے ٹھہرائے ہوئے دین کی حقیقت تو یہ تھی کہ وہ نوعِ انسانی پر خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ کھولتا تھا لیکن لوگوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا اور انسانیت، نسلوں، قوموں، ملکوں اور طرح طرح کی رسموں اور رواجوں میں بٹ گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اعتقاد و عمل کے بجائے سارا دارومدار اس پر آکر ٹھیر گیا کہ کون کس جتھے اور گروہ میں داخل ہے اور اسی کو صداقتِ دین کی کسوٹی بنا لیا گیا، گویا دین کی سچائی، آخرت کی نتیجہ اور حق و باطل کا معیار تمام تر گروہ بندی اور گروہ پرستی ہو گئی اور ہر گروہ یقین کرنے لگا کہ دوسروں پر نجات کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور وہی نجات کا مستحق ہے۔ اور فی الحقیقت دوسرے مذاہب کی نفرت نے خدا پرستی اور نیک عملی کی جگہ لے لی۔

قرآنی رویّہ قرآن کو گمراہی کا یہ طلسم توڑنا تھا چنانچہ اُس نے انسان کی نجات وسعادت کا دارومدار کسی خاص گروہ بندی پر نہیں بلکہ اعتقاد وعمل پر رکھا۔ اُس نے اس بات پر زور دیا کہ نوعِ انسانی کے لئے دینِ الٰہی ایک ہی ہے اور اس راستے سے انحراف دین کی نفی ہے۔ اُس نے بتایا کہ اصل دین توحید ہے یعنی کسی واسطے کے بغیر ایک خدا کی براہِ راست پرستش اور تمام بانیانِ مذاہب نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ اس کے خلاف' دین سے متخاصم ہونے والے جتنے عقائد واعمال ہیں وہ خدا کے انکار کی تعریف میں آتے ہیں۔

وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲: ۱۰۶)

اور یہود ونصاریٰ نے کہا جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہودی اور نصاریٰ نہ ہو (یعنی جب تک یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں داخل نہ ہو) یہ ان لوگوں کی (جاہلانہ) امنگیں ہیں۔ (اے پیغمبر!) اُن سے کہدو' اگر تم (اس زعم باطل میں) سچے ہو تو بتلاؤ تمہاری دلیل کیا ہے؟ ہاں (بلاشبہ نجات کی راہ کھلی ہوئی ہے' مگر وہ کسی خاص گروہ بندی کی راہ نہیں ہو سکتی وہ تو ایمان وعمل کی راہ ہے) کسی نے بھی خدا کے آگے سر جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو (خواہ وہ یہودی اور نصرانی ہو خواہ کوئی ہو) وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر پائے گا۔ اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا' نہ کسی طرح کی غمگینی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ

جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے ہیں وہ ہوں یا

هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (۲:۶۲)

وہ لوگ ہوں جو یہودی کہلاتے ہیں یا نصاریٰ اور صابی ہوں (کوئی بھی ہو) لیکن جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے کام بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا۔ اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یعنی قرآن کے الفاظ میں دین کسی گروہ بندی کا نام نہ تھا۔ انسان کا تعلق کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے ہو اگر وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے اعمال بھی نیک ہیں یعنی اس کی زندگی نیک عملی کا نمونہ ہے تو وہ دینِ الٰہی پر چلنے والا ہے اور اس کے لئے نجات ہے۔ لیکن یہودیوں اور عیسائیوں نے صرف اپنے لئے ایک خاص قسم کا ضابطۂ فکر و اخلاق بنا لیا۔ یہودیوں نے گروہ بندی کا ایک دائرہ کھینچا اور اس کا نام "یہودیت" رکھ دیا۔ عیسائیوں نے بھی اپنے اطراف ایسا ہی ایک حلقہ بنا لیا اور اس کو "مسیحیت" کا نام دے دیا اور ہر ایک نے یہی کہا کہ جو اس کے دائرے میں شامل ہے وہی سچائی پر ہے اور نجات اسی کے لئے ہے اور جو اس سے باہر ہے وہ نجات سے قطعاً محروم ہے اور اس طرح ایمان باللہ اور نیک عملی کا عالمگیر تصور یک قلم غیر مؤثر ہو گیا۔ ایک شخص کتنا ہی خدا پرست اور نیک عمل ہو لیکن اگر وہ "یہودیت" یا "مسیحیت" کے دائرہ میں داخل نہیں ہے تو اسے کوئی یہودی یا عیسائی ہدایت یافتہ انسان نہیں سمجھے گا لیکن ایک انتہائی بدعمل اور بداعتقاد انسان بھی نجات یافتہ سمجھ لیا جائیگا اگر وہ گروہ بندیوں کے اس نظام میں داخل ہے۔ قرآن اس قسم کی گروہ بندیوں کو مسترد کر دیتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ کوئی انسان ہو کسی نسل و قوم یا گروہ کا ہو

اگر اس نے اللہ کے آگے عبودیت کا سر جھکایا اور نیک عملی کی زندگی اختیار کی تو اس نے نجات و سعادت پائی اور اس کے لئے کوئی غم اور کھٹکا نہیں۔ مذہبی صداقت کی عالمگیر وسعت کا یہی وہ تصور ہے جو قرآن ظاہر کرتا ہے لیکن وہ افسوس کے ساتھ کہتا ہے:۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۲: ۱۱۳)

اور یہودیوں نے کہا عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے اسی طرح عیسائیوں نے کہا یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے؟ حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں (اور دونوں کا سرچشمہ دین ایک ہی ہے) ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی جو (مقدس نوشتوں کا) علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب نے کہ وہ بھی صرف اپنے ہی کو نجات کا وارث سمجھتے ہیں) اچھا، جس بات میں باہمد گر جھگڑ رہے ہیں، قیامت کے دن اللہ اس کا فیصلہ کر دیگا (اور اس وقت حقیقتِ حال سب پر کھل جائے گی)

یہودیوں نے تو یہ انتہا کر دی تھی کہ وہ سمجھنے لگے تھے کہ جہنم کی آگ انہیں چھو بھی نہیں سکتی لیکن قرآن صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہے کہ جس کسی نے بھی اچھا کام کیا اس کے لئے بھلائی ہے اور جس نے برا کام کیا اس کے لئے برائی ہے اور کسی مخصوص نسل یا شخص کی خاطر فطرت کا یہ قانون بدل نہیں سکتا۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ

اور ان لوگوں نے (یعنی یہودیوں نے) کہا ہمیں جہنم کی آگ کبھی چھونے والی نہیں اور اگر چھوئے بھی تو اس سے زیادہ نہیں کہ چند دنوں کے لئے چھوئے (اے پیغمبر!) ان سے کہو یہ جو تم کہتے ہو تو کیا تم نے

عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲ : ۸۱)

خدا سے کوئی قول و قرار کرالیا ہے اور وہ اب اپنے قول و قرار سے پھر نہیں سکتا یا پھر تم خدا کے نام سے ایک ایسی (جھوٹی) بات کہہ رہے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں؟ نہیں (خدا کا قانون تو یہ ہے کہ کسی نسل اور کسی گروہ کا انسان ہو لیکن) جس کسی نے بُرائی کمائی اور اپنے گناہوں میں گھر گیا تو وہ دوزخی گروہ میں سے ہے۔ ہمیشہ دوزخ میں رہنے والا اور جس کسی نے بھی ایمان کی راہ اختیار کی اور نیک عمل ہوا تو وہ بہشتی گروہ میں سے ہے ہمیشہ بہشت میں رہنے والا۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ (۴ : ۱۲۳)

(مسلمانو! یاد رکھو نجات اور سعادت) نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر (خدا کا قانون تو یہ ہے کہ) جو کوئی بھی بُرائی کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سامنے آئے گا اور پھر نہ تو کسی کی دوستی بچا سکے گی نہ کسی طاقت کی مددگاری۔

اسی گروہ بندی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ یہودی سمجھتے تھے کہ کاروبار کی انجام دہی میں سچائی اور دیانتداری کے جتنے بھی احکام ان کے لئے نازل ہوئے ہیں غیر یہودیوں کے ساتھ معاملت کرتے وقت اُن کی پابندی ضروری نہیں انہوں نے یہ خیال قائم کر لیا تھا کہ جو آدمی ہمارا ہم مذہب نہیں ہے تو ہمارے لئے روا ہے کہ جس طرح بھی چاہیں اُس کے مال و جائداد کو ہضم کر لیں چنانچہ لین دین میں سود لینے کی ممانعت کو انھوں نے صرف اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا،

دوسروں کے ساتھ اس اصول کو ملحوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں جو یہودی عرب میں آباد تھے وہ عربوں کے ساتھ اسی قسم کا طرزِ عمل رکھتے تھے وہ کہتے تھے کہ عرب کے باشندے ان پڑھ اور بُت پرست ہیں، ہم ان لوگوں کا مال جس طرح بھی کھالیں ہمارے لئے جائز ہے:۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (۴: ۵۹)

اور اُن کا سود کھانا حالانکہ وہ اس سے روک دئے گئے تھے اور ان کی یہ بات کہ لوگوں کا مال ناجائز طریقے پر کھا لیتے تھے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ (۳: ۷۰)

(یہودیوں کی) یہ (بدمعاملگی) اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں (عرب کے) اِن اَن پڑھ لوگوں سے (بدمعاملگی) کرنے میں ہم سے کوئی بازپرس نہیں ہوگی (جس طرح بھی ہم چاہیں ان کا مال کھا سکتے ہیں حالانکہ) ایسا کہتے ہوئے وہ صریح اللہ پر افترا کرتے ہیں۔ ہاں (اُن سے بازپرس ہو اور ضرور ہو کیونکہ اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ، جو کوئی اپنا قول و قرار سچائی کے ساتھ پورا کرتا ہے اور برائی سے بچتا ہے تو وہی اللہ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے اور اللہ برائی سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

ایسا عقیدہ رکھنا خدا کے دین پر صریح افترا تھا۔ خدا کا دین تو یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ نیکی کرنی چاہئے اور ہر ایک کے ساتھ معاملہ کرنے میں راست بازی اور دیانتداری کو ملحوظ رکھنا چاہئے، چاہے اس کا تعلق کسی عقیدہ یا گروہ سے کیوں نہ ہو۔

مذہبی گروہ بندیوں نے جن رسموں کو جنم دیا ان میں سے ایک رسم وہ ہے جسے اصطباغ (بپتسما) کہتے ہیں، یہ دراصل ایک یہودی رسم تھی جو اس وقت ادا

کی جاتی تھی جب کوئی گناہوں کا اعتراف اور ان سے توبہ کرتا تھا لیکن عیسائیوں نے اُسے ایک ذریعۂ نجات بنا دیا۔ قرآن اسے گمراہی بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ محض ایک مقررہ رسم ادا کر دینے سے نجات و سعادت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ نجات و سعادت تو حاصل ہوتی ہے نیک عملی سے۔ قرآن کہتا ہے کہ صرف پانی چھوا دینے سے اصطباغ نہیں ہوتا بلکہ اصطباغ یہ ہے کہ تمہارے دل خدا پرستی کے رنگ میں رنگ جائیں۔ قرآن کہتا ہے:۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۖ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○ (۲: ۱۳۸)

یہ اللہ کا رنگ ہے (یعنی دینِ الٰہی کا قدرتی اصطباغ ہے) اور اللہ سے بہتر رنگ دینے میں اور کون ہو سکتا ہے؟ ہم تو اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ یہودیوں اور عیسائیوں کا مذہب ایک ہی تھا اور کتابِ الٰہی یعنی تورات دونوں کی مشترکہ میراث تھی لیکن دو مذہبی گروہوں میں بٹ جانے کی وجہ سے وہ باہمدگر مخالف اور مُکذّب ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کو جھٹلاتے اور ہر جتھا صرف اپنے ہی جتھے کے لوگوں کو نجات و سعادت کا مالک سمجھتا تھا۔

جب دنیا اتنے گروہوں اور جتھوں میں بٹ گئی تھی اور ہر جتھا دوسرے جتھے کے مذہب کو جھٹلا رہا تھا اِس حقیقت کے باوجود کہ ان سب کی اصل ایک ہی تھی، تو یہ فیصلہ کون کرتا کہ سچائی کا حقیقی نمائندہ کون ہے؟ قرآن کہتا ہے سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً اُسے سب نے کھو دیا ہے، سب کو ایک ہی دین دیا گیا تھا اور سب کے لئے ایک ہی عالمگیر قانونِ ہدایت تھا لیکن سب نے اصل حقیقت ضایع کر دی اور "دین" یا راہِ راست پر قائم رہنے کی جگہ ہر گروہ نے الگ الگ راستے اختیار کر لئے اور یہ سمجھ بیٹھا کہ سعادت و نجات کا وہی مستحق ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہدایت کا راستہ سب کے لئے کھلا ہے اور کسی خاص نسل یا قوم کے لئے مختص نہیں ہے۔

باب ششم

وحدتِ انسان

جن لوگوں نے خدا کے نام پر اپنے آپ کو الگ الگ مذہبی گروہوں میں بانٹ لیا تھا اُن کے بارے میں قرآن کا یہ انتباہ تھا کہ "کیا اپنے پروردگار کے سامنے وہ تم سے جھگڑتے رہیں گے؟"

اگر خدا پر سچے دل سے ایمان لایا جائے تو عمل کی زندگی میں یہ ایمان، انسانی اخوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی قرآن کا پیام تھا اور اس نے یہودیوں عیسائیوں اور پیغمبرؐ کے زمانے کے عرب مشرکین کو یہی پیام دیا تھا۔ اس کی اصل تبلیغ یہ تھی کہ یہ سارے گروہ اور مذہبی جتھے پھر ایک جگہ آجائیں اور بنی نوعِ انسان کی عظیم تر اُخوت کا راستہ ہموار کریں۔ مولانا آزاد نے قرآن کے مطالعہ سے اسی پیام کا استخراج فرمایا ہے۔

قرآن نے اخوتِ انسانی کا جو لائحہ عمل دیا ہے اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ ابتدا میں نوعِ انسانی ایک ہی جمعیت تھی جو سارے انسانوں کے ایک خدا پر ایمان رکھتی تھی اور اسی ایمان کے مطابق شروع میں تمام انسانوں نے دین یا زندگی کا ایک ہی راستہ اختیار کیا تھا۔ سابقہ باب میں بتایا گیا ہے کہ کس شدت کے ساتھ قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ زندگی کی یہ راہ سب کے لئے ایک ہی ہو سکتی ہے اور اسی اصول کے تحت اس زمانے کے یہودیوں، عیسائیوں اور عربوں کو مخاطب کیا ہے۔ ان سب میں یہ بات

قدرِ مشترک تھی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کو اپنے مشترکہ مورثِ اعلیٰ کا مرتبہ دیتے تھے اور یکساں طور پر اُن کا احترام کرتے تھے۔ پس قرآن ان کے سامنے ایک نہایت سیدھا سادا سوال پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہر ایک کے دین کی سچائی اس کے اپنے گروہ کے ساتھ وابستہ ہے تو بتلاؤ کہ یہ سب کے مورثِ اعلیٰ، حضرت ابراہیمؑ کس گروہ کے آدمی تھے؟ اُن کے زمانے میں نہ تو یہودیت کا ظہور ہوا تھا اور نہ مسیحیت کا تو پھر ان کا کون سا راستہ یا دین تھا؟

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِن بَعْدِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۳: ۵۸)

اے اہلِ کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو حالانکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ تورات اور انجیل نازل نہیں ہوئیں مگر اس کے بعد پھر اتنی صاف بات بھی سمجھ نہیں سکتے؟

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي ۖ قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ (۲: ۱۲۷)

پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کے سامنے موت آکھڑی ہوئی تھی اور اس نے اپنی اولاد سے پوچھا تھا، بتلاؤ میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ انھوں نے جواب میں کہا تھا اسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جس کی تو نے عبادت کی ہے اور تیرے بزرگوں، ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ نے کی ہے اور ہم خدا کے حکموں کے فرمانبردار ہیں۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (۲: ۱۲۹)

اور یہودی کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ ہدایت پاؤگے نصاریٰ کہتے ہیں نصرانی ہو جاؤ ہدایت پاؤگے۔ (اے پیغمبر!) تم کہو نہیں! (اللہ کی عالمگیر ہدایت تمہاری اِن گروہ بندیوں کی پابند نہیں رہ سکتی)

ہدایت کی راہ تو وہی حنفی راہ ہے جو ابراہیمؑ کا طریقہ

تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

اس طرح قرآن نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہودی، عیسائی اور مغربی ایشیا کی دوسری اقوام اپنے مورثِ اعلیٰ ابراہیمؑ کے زمانہ میں جس دین کے پیرو تھے وہ نہ یہودیت تھا نہ مسیحیت اور نہ کسی اور مذہبی حلقہ بندی سے اس کا تعلق تھا۔ یہودیت اور مسیحیت تو حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ کے نام سے چلے جن کا ظہور حضرت (ابراہیمؑ) کے کئی سو سال بعد ہوا تھا اور حضرت ابراہیمؑ نے نجات کا جو راستہ اختیار کیا تھا وہ صرف کسی مخصوص گروہ کے لئے نہ تھا بلکہ پوری انسانیت کے لئے تھا اور وہ تھا ایک ہی خدا کی پرستش اور نیک عملی کا راستہ قرآن کہتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں نے دنیا کو جو پیام دیا وہ یہی تھا کہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی اُمت ہے اور سب کا ایک ہی پروردگار ہے۔ پس چاہئے کہ سب اسی ایک پروردگار کی بندگی کریں اور ایک کنبہ کے افراد کی طرح رہیں۔ قرآن نے پچھلے رسولوں اور مذاہب کے بانیوں کے مواعظ نقل کئے ہیں یہ بتانے کے لئے کہ اُن سب نے دین کی وحدت اور انسان کی عالمگیر اخوت کی تعلیم دی ہے لیکن قرآن افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ:-

فَتَقَطَّعُوٓا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا ؕ	لیکن لوگوں نے یہ تعلیم فراموش کر دی اور اپنی الگ
كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝	الگ ٹولیاں بنالیں، اب ہر ٹولی اس میں مگن
(۲۳ : ۵۵)	ہے جو اُس کے پلے پڑ گیا ہے۔

قرآن کی دعوت

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ قرآن نے کسی اور بات پر اتنا زور نہیں دیا ہے جتنا کہ اس نظریۂ حیات پر۔ اُس نے بارہا

صاف اور قطعی لفظوں میں اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ کسی مذہبی گروہ بندی کے حق میں نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چاہتا ہے کہ تمام مذہبی گروہ بندیوں کی جنگ و نزاع سے دنیا کو نجات دلا دے اور سب کو سچائی کی اسی ایک راہ پر جمع کر دے جس کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ روزِ اول سے موجود ہے اور تمام مذاہب کے داعیوں نے اسی کی طرف بلایا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ

(۴۲ : ۱۳)

اور (دیکھو) اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ ٹھہرائی ہے جس کی وصیت نوحؑ کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا (ان سب کی تعلیم یہی تھی) کہ الدین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں اسی طرح اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے جس طرح نوحؑ کو کیا تھا اور ان تمام نبیوںؑ کو کیا تھا جو نوحؑ کے بعد ہوئے نیز جس طرح ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، اولادِ یعقوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ، سلیمانؑ اور عیسیٰؑ کو مخاطب کیا اور داؤدؑ کو زبور عطا کی (علاوہ ان کے) وہ رسول جن میں سے بعض کا حال ہم تمہیں پہلے سنا چکے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کا حال تمہیں نہیں سنایا۔

(۴ : ۱۶۳)

سورۂ انعام رکوع (۶) میں پچھلے رسولوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے اِن الفاظ میں پیغمبر اسلام محمدؐ کو مخاطب کیا ہے:-

اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (۶ : ۹۰)

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے راہِ حق دکھلائی پس (اے پیغمبر!) تم بھی انھیں کی ہدایت کی پیروی کرو۔

تمام بانیانِ مذاہب کے پیروؤں کو ایک ہی راستے پر لانے کے لئے قرآن نے تمام بانیانِ مذاہب کی یکساں طور پر تصدیق فرمائی ہے اور اُن کے راستے کو راہِ حق بتایا ہے:-

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (۳ : ۸۴)

(اے پیغمبر!) کہدو ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ اُس نے ہم پر نازل کیا ہے اس پر ایمان لائے ہیں نیز جو کچھ ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اسحٰقؑ یعقوبؑ اور اولاد یعقوب پر نازل ہوا ہے ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو اور دنیا کے تمام نبیوں کو اُن کے پروردگار سے دیا گیا ہے سب پر ہمارا ایمان ہے ہم اُن میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ اسے نہ مانیں دوسروں کو مانیں) اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں (اس کی سچائی جہاں کہیں بھی اور جس کسی کی زبانی بھی آئی ہو اس پر ہمارا ایمان ہے)

اوپر کی آیت کے یہ الفاظ کہ "ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کرتے" قرآن میں متعدد موقعوں پر آئے ہیں جس کا منشا یہ ہے کہ ایک رسول کو دوسرے رسول سے برتر سمجھنے یا ایک پیغمبر کو ماننے اور دوسرے کو

برحق نہ جاننے کے رجحان سے انکار کیا جائے۔ قرآن کہتا ہے، ہر انسان کا جو خدا کے سچے دین پر چلنا چاہتا ہے، فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں اور اُن پر نازل کئے ہوئے تمام صحائف پر اور ان کی بنیادی صداقت پر ایمان لائے اور یہ سچائی جہاں کہیں بھی ظاہر ہوئی ہو اور جس زبان میں بھی ظاہر ہوئی ہو اُسے قبول کرے۔

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۚ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (۲ : ۲۸۵)

اللہ کا رسول اس (کلامِ حق) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے اور وہ لوگ بھی جو ایمان لائے ہیں یہ سب اللہ پر اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں (ان کے ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں) انہوں نے کہا خدایا! ہم نے تیرا پیام سُنا اور تیری فرمانبرداری کی۔ ہمیں تیری مغفرت نصیب ہو۔ ہم سب کو بالآخر تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

قرآن کہتا ہے خدا کی سچائی اُس کی عالمگیر بخشش ہے وہ نہ تو کسی خاص نسل وقوم سے متعلق ہے اور نہ کسی خاص مذہبی گروہ بندی سے اور نہ کسی خاص زبان میں اس کا نزول ہوا ہے۔ انسان اپنے لئے جغرافیائی اور نسلی حدبندیاں قائم کرلیتا ہے لیکن خدا کی سچائی کو اس طرح بانٹا نہیں جا سکتا۔ اس سچائی کی نہ تو کوئی قومیت ہے، نہ نسل ہے، نہ جغرافیائی حدبندی ہے اور نہ جماعتی حلقہ بندی ہے وہ خدا کے پیدا کئے ہوئے سورج کی طرح کرۂ ارض کے ہر گوشے پر ضیاپاشی کرتی

اور ہر ایک کو یکساں طور پر روشنی بخشتی ہے، وہ ہر جگہ نمودار ہوتی ہے اور ہر عہد میں اپنا ظہور رکھتی ہے۔ خدا کی سچائی جہاں کہیں بھی پائی جائے اور جس بھیس میں بھی پائی جائے، انسان کی بہت بڑی متاع ہے اور انسان اس کا وارث ہے۔

قرآن نے جا بجا "تفریق بین الرُّسُل" کی راہ کو خدا کے دین سے انکار کی راہ قرار دیا ہے، قرآن تمام رسولوں کی یکساں طور پر تصدیق کرتا ہے پس انسان کے لئے دو ہی راستے ہیں، ایک سب نبیوں کو ماننے کا راستہ اور دوسرا سب کے انکار کا راستہ، کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔ کسی ایک رسول کا انکار بھی سب کے انکار کا حکم رکھتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ
وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ
یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ
وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ
وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ لا وَّیُرِیْدُوْنَ
اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ
سَبِیْلًا ○ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ
حَقًّا ○ وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ
عَذَابًا مُّھِیْنًا ○ وَالَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ
یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ
اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ

جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں سے برگشتہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفرقہ کریں (یعنی کسی کو خدا کا رسول مانیں کسی کو نہ مانیں)، اور کہتے ہیں ان میں سے بعض کو ہم مانتے ہیں بعض کا انکار کرتے ہیں اور پھر اس طرح چاہتے ہیں، کفر اور ایمان کے درمیان کوئی تیسرا راستہ اختیار کرلیں تو یقین کرو یہی لوگ ہیں کہ ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں اور جن لوگوں کی راہ کفر کی راہ ہے تو اُن کے لئے رسوا کن عذاب تیار ہے لیکن ہاں جو لوگ اللہ اور اس کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے اور کسی ایک پیغمبر کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کیا (یعنی کسی ایک کی سچائی سے بھی انکا

أُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۴ : ۱۴۹)

نہیں کیا، تو بلاشبہ یہی لوگ ہیں جنھیں عنقریب اللہ اُن کے اجر عطا فرمائے گا اور وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے!

سورۂ بقرہ میں جو قرآن کی دوسری سورت ہے سچے مومنوں کی راہ یہ تبلائی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۲ : ۴ : ۵)

اور وہ لوگ جو اس سچائی پر ایمان لائے جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی ہے اور اُن تمام سچائیوں پر جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور نیز آخرت کی زندگی پر بھی یقین رکھتے ہیں، سو یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی ٹھیرائی ہوئی ہدایت پر ہیں اور یہی ہیں جنھوں نے فلاح پائی۔

قرآن اس بات پر تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ وہ لوگ بھی جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ تمام کارخانۂ ہستی کا خالق ایک ہی خالق ہے اور اُسی کی پروردگاری ہر مخلوق کی پرورش کر رہی ہے اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ اس کا دیا ہوا روحانی سچائی کا قانون بھی ایک ہے اور ایک ہی طور پر تمام نوعِ انسانی کو دیا گیا ہے۔

قُلْ يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ إِلَّآ أَنْ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (۵ : ۵۹)

ان لوگوں سے کہو کہ اے اہلِ کتاب! تم جو ہماری مخالفت میں کمربستہ ہو گئے ہو تو بتلاؤ اس کے سوا ہمارا جرم کیا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے اور جو اس سے پہلے نازل ہوا ہے سب پر ایمان رکھتے ہیں؟ (پھر کیا خدا پرستی) اور خدا کے تمام رسولوں کی تصدیق کرنا تمہارے نزدیک جرم اور عیب ہے؟ (افسوس تم پر!) تم میں سے اکثر ایسے ہیں جو راہِ حق سے یکسر برگشتہ ہیں۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ (۳۶:۱۹)
دیکھو، خدا تو میرا اور تمہارا، دونوں کا پروردگار ہے پس اسی کی بندگی کرو، یہی دین کی سیدھی راہ ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ○ (۲:۱۳۹)
(اے پیغمبر اُن سے) کہو کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو حالانکہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار وہی ہے اور ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں، تمہارے لئے تمہارے اعمال (یعنی ہر انسان کو اُس کے عمل کے مطابق نتیجہ ملتا ہے پھر اس بارے میں جھگڑا کیوں ہو؟)

اس موقع پر یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اُوپر کی آیات میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں جیسے اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ (اللہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے)، اِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ (ہمارا اور تمہارا دونوں کا خدا ایک ہی ہے) وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (اور ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے عمل)۔ ——

اس قسم کے تمام مخاطبات سے قرآن کا مقصود اس حقیقت پر زور دینا ہے کہ سب کا پروردگار ایک ہے اور ہر انسان کے لئے ویسا ہی نتیجہ ہے جیسا اس کا عمل ہے۔ اسی لئے قرآن پوچھتا ہے "تو پھر خدا اور مذہب کے نام پر یہ عالمگیر جنگ وجدال کیوں برپا ہے؟" وہ بار بار کہتا ہے کہ اس کی تعلیمات اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ انسان کو خدا پرستی اور نیک عملی کی طرف بُلاتا ہے اور وہ کسی مذہب کو نہیں جھٹلاتا اور نہ کسی بانئِ مذہب کا انکار کرتا ہے، وہ سب بانیانِ مذاہب کی یکساں تصدیق کرتا ہے اور سب کی مشترکہ تعلیم اس کا دستور العمل ہے، پھر جب اس کا پیام یہ ہے تو قرآن پوچھتا ہے کہ تمام پیروانِ مذاہب نے کیوں اُس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے؟

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ "قرآن نے کبھی کسی مذہب کی پیروی کرنے والوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اُسے ایک نئے دین کے طور پر مان لیں بلکہ وہ اُن سے یہی کہتا ہے کہ اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر، جسے انھوں نے طرح طرح کی تحریفوں اور اضافوں سے مسخ کر دیا ہے، سچائی کے ساتھ کاربند ہو جائیں، وہ کہتا ہے کہ اگر انھوں نے ایسا کر لیا تو اس کا مقصد پورا ہو جائے گا کیونکہ جوں ہی وہ اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم کی طرف لوٹیں گے اُن کے سامنے وہی حقیقت آموجود ہوگی جس کی طرف قرآن انھیں بلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا پیام کوئی نیا پیام نہیں ہے بلکہ وہی قدیم پیام ہے جو تمام بانیانِ مذاہب دے چکے ہیں:-

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۵: ۶۸: ۶۹)

اے اہلِ کتاب! جب تک تورات اور انجیل کی اور اُن تمام صحیفوں کی جو تم پر نازل ہوئے ہیں حقیقت قائم نہ کرو اس وقت تک تمہارے پاس دین میں سے کچھ بھی نہیں ہے اور (اے پیغمبر!) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے (بجائے اس کے کہ یہ لوگ اُس سے ہدایت حاصل کریں، تم دیکھو گے کہ) ان میں سے بہتوں کا کفر و طغیان اس کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ جائے گا، تو جن لوگوں نے انکارِ حق کی راہ اختیار کر لی ہے تم اُن کی حالت پر بیکار کو غم نہ کھاؤ جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں، جو یہودی ہیں جو صابی ہیں جو نصاریٰ ہیں (یہ ہوں یا کوئی ہو) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے عمل

بھی نیک ہوئے تو اس کے لیے نہ تو کسی طرح خوف ہے،
نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اُن راست باز انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزولِ قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنھوں نے اپنے مذاہب کی حقیقی رُوح ضائع نہیں کی تھی، البتہ وہ کہتا ہے ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، غالب تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے حقیقی مذہب کے راستے سے منحرف ہو گئے ہیں:-

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ (۳: ۱۱۲: ۱۱۵)

یہ بات نہیں ہے کہ سب ایک ہی طرح کے ہوں، انھیں اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اصل دین پر قائم ہیں وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں اور اُن کے سر اس کے سامنے جھکے ہوتے ہیں! اور وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں بُرائی سے روکتے ہیں۔ نیکی کی راہوں میں تیز گام ہیں اور بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو نیک انسانوں میں سے ہیں اور (یاد رکھو) یہ لوگ جو کچھ بھی نیکی کرتے ہیں تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی قدر نہ کی جائے، وہ جانتا ہے کہ (کس گروہ میں) کون پرہیزگار ہے۔

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۵: ۶۶)

ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو میانہ رو ہیں لیکن بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں بُرائی کرتے ہیں۔

یہ جو قرآن جا بجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ وہ پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جھٹلانے والا نہیں اور اُن کے پیروؤں سے کہتا ہے کہ قرآن پر بھی ایمان لاؤ تو اس سے مقصود بھی اسی حقیقت پر زور دینا ہے کہ اُن کے ایمان اور مقدس نوشتوں کے خلاف قرآن کوئی نیا دین نہیں پیش کرتا اور نہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے ادیان سے منحرف ہو جائیں۔ بلکہ فی الحقیقت انھیں اپنے اپنے اصل دین پر مضبوطی سے جمے رہنے کی تائید کرتا ہے اور اسی لئے تعجب کے ساتھ پوچھتا ہے کہ "پھر کیوں وہ قرآن کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں یا اُس سے جھگڑتے ہیں"؟

اسی لئے قرآن نے نیکی کے واسطے 'معروف' کا اور بُرائی کے واسطے 'منکر' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳۱: ۱۷)

'معروف' کا لفظ "عرف" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں جانی پہچانی بات کو پہچاننا اور 'منکر' کے معنے ہیں ایسی بات جس سے عام طور پر انکار کیا گیا ہو۔ قرآن نے اِن الفاظ کو خاص طور پر اس لئے اختیار کیا ہے کہ انسانوں کے افکار وعقائد میں چاہے کسی قسم کے اختلافات کیوں نہ ہوں کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے اچھے ہونے پر سب متفق ہیں اور جن کے بُرے ہونے پر سب کا اتفاق ہے مثلاً اس بات میں سب متفق ہیں کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا بُرا ہے' اس پر سب کو اتفاق ہے کہ دیانتداری اچھی بات ہے بد دیانتی بُری۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ ماں باپ کی خدمت' ہمسایہ سے سلوک' مسکینوں کی خبرگیری اور مظلوم کی امداد اچھی باتیں ہیں اور ان کے بارے میں کوئی بھی مختلف نظریہ

نہیں رکھتا۔ دنیا کے تمام اخلاقی ضابطے، دُنیا کی تمام حکمتیں اور دنیا کی تمام جماعتیں، دوسری باتوں میں کتنا ہی اختلاف رکھتی ہوں لیکن جہاں تک ان اچھائیوں کا تعلق ہے سب ہم آہنگ وہم رائے ہیں۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ جب "وہ معروف (نیکی) کا حکم دیتا ہے اور منکر (برائی) سے منع کرتا ہے تو اس کی مخالفت کیوں ہو؟

فطرت اللہ

قرآن کہتا ہے کہ یہی راہِ عمل جو اُس نے مقرر کی ہے، دوسرے قوانینِ فطرت کی طرح نوعِ انسانی کے لئے ایک قانونِ فطرت ہے اور اگر تم اُس سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس پر چلو۔ یہ خدا کا ٹھیرایا ہوا راستہ ہی فطری دین ہے، ایسا قانون ہے جس میں کسی کے لئے تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایسا دین ہے جسے تمام انبیاء نے اختیار کیا اور تبلیغ کی۔ یہی وہ مذہب ہے جس کو قرآن "اسلام" کا نام دیتا ہے یعنی خدا کے ٹھیرائے ہوئے قوانینِ حیات کی فرمانبرداری کا راستہ:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ۝ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا

تم ہر طرف سے منہ پھیر کر الدین کی طرف رُخ کرو یہی خدا کی بناوٹ ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی "الدین القیم" (یعنی سیدھا اور سچا دین) ہے لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو نہیں جانتے (دیکھو!) اسی (ایک خدا) کی طرف متوجہ رہو۔ اس کی نافرمانی سے بچو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہوجاؤ۔ جنھوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور گروہ بندیوں میں بٹ گئے

لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ (۳۰ : ۳۰) ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے۔

یہی وہ اسلام ہے جس کا پیام زمانۂ دراز سے تمام انبیائے کرام دیتے آئے ہیں، یہی سچّا دین یا خدا کا ٹھیرایا ہوا راستہ ہے۔ قرآن نے سورۂ فاتحہ میں اسی کو "صراطِ مستقیم" سے تعبیر کیا ہے جس پر چل کر افراد اور جماعتیں زندگی میں نیکی یا کامیابی پاتی ہیں یعنی قرآن کے الفاظ میں انھیں خدا کا "انعام" حاصل ہوتا ہے اور اس راستے سے منحرف ہونے والے نابود ہو جاتے ہیں یا اُن پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔ اگر وہ مختلف گروہ جن میں بنی نوعِ انسان نے اپنے آپ کو بانٹ لیا ہے خدا پرستی اور نیک عملی کے راستے پر لوٹ آنے کا تہیہ کر لیں جو سب کے یہاں اصل دین ہے ـــ اور رفتارِ زمانہ نے ان اصولوں میں جو انحراف اور گمراہی پیدا کر دی ہے، اُس سے باز آجائیں تو قرآن کا مقصد پورا ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔

اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ۚ
وَمَا اخۡتَلَفَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا
الۡكِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَ
هُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَ
مَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ
اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ۝ فَاِنۡ
حَآجُّوۡكَ فَقُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِىَ
لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلۡ
لِّلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَ
الۡاُمِّيّٖنَ ءَاَسۡلَمۡتُمۡ ؕ فَاِنۡ

اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے اور وہ الاسلام ہے اور یہ جو اہلِ کتاب نے اختلاف کیا (اور ایک دین پر مجتمع رہنے کی جگہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں بٹ گئے) تو یہ اس لئے ہوا کہ اگرچہ علم حقیقت کی راہ ان پر کھل چکی تھی لیکن آپس کی ضد اور سرکشی سے اختلاف میں پڑ گئے اور (یاد رکھو) جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے (تو اللہ کا قانونِ مکافات بھی) حساب لینے میں سست قدم نہیں۔ پھر اگر یہ لوگ تم سے اس بارے میں جھگڑا کریں تو تم کہو، میری اور میرے پیرووں کی راہ تو یہ ہے

اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (۳ : ۱۸)

کہ اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا اور ہم نے سر جھکا دیا ہے پھر اہلِ کتاب سے اور اَن پڑھ لوگوں سے (یعنی مشرکین عرب سے) پوچھو تم بھی اللہ کے آگے جھکتے ہو یا نہیں؟ (یعنی ساری باتیں جھگڑے کی چھوڑ دو یہ تبلاؤ تمہیں خدا پرستی منظور ہے یا نہیں؟) اگر وہ جھک گئے تو (سارا جھگڑا ختم ہوگیا اور) انھوں نے راہ پالی۔ اگر رُوگردانی کریں تو تمہارے ذمّے جو کچھ ہے وہ پیامِ حق پہنچا دینا ہے اور اللہ کی نظروں سے بندوں کا حال پوشیدہ نہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانونِ فطرت انسان کے لئے ٹھیرا دیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ درحقیقت تمام کائناتِ ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ اگر عالمِ تخلیق ذرہ برابر بھی اس راستے سے انحراف کرے تو سارا کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ ۝ (۳ : ۸۲)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں اللہ کا ٹھیرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب چار و ناچار اسی کے (ٹھیرائے ہوئے قانونِ عمل کے) آگے جھکے ہوئے ہیں اور (بالآخر) سب کو اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔

جب قرآن کہتا ہے کہ ’الاسلام‘ یا اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے کا راستہ ہی خدا کا دین ہے اور ہر رسول نے اُسی دین کی تبلیغ فرمائی ہے

تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی دین یا راستہ گروہ بندی یا تفرقہ اندازی پر مبنی ہوگا اور خدا کا عالمگیر دین نہیں ہوگا۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۳ : ۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے گا تو یاد رکھو اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائے گی اور وہ آخرت کے دن دیکھے گا کہ تباہ ہونے والوں میں سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تمام پیروانِ دعوت کو بار بار متنبہ کیا ہے کہ دین میں تفرقہ اندازی اور گروہ بندی سے بچیں اور اسی گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے قرآن نے نجات دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے میری دعوت نے ان تمام انسانوں کو جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے خدا پرستی کی راہ میں اس طرح جوڑ دیا کہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے ایک دوسرے کے جاں نثار بھائی بن گئے' یہودی' عیسائی' مجوسی اور صابی ان سب کو دعوتِ قرآنی نے ایک صف میں کھڑا کر دیا اور اب یہ سب ایک دوسرے کے بانیانِ مذہب کی تصدیق کرتے ہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ

اور (دیکھو) سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اللہ نے تم پر جو فضل و کرم کیا ہے اُسے یاد کرو، تمہارا حال یہ تھا کہ ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے۔ پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں باہمد گر الفت پیدا کر دی پھر ایسا ہوا کہ انعامِ الٰہی سے بھائی بھائی ہو گئے اور (دیکھو) تمہارا حال یہ تھا گویا آگ سے بھرا ہوا گڑھا ہے اور

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۳ : ۱۰۳)

اس کے کنارے کھڑے ہو لیکن اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ اس طرح اپنی کارفرمائیوں کی نشانیاں تم پر واضح کرتا ہے تاکہ ہدایت پاؤ۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ (۳ : ۱۰۵)

اور (دیکھو) اُن لوگوں کی سی چال اختیار نہ کر لینا جو (ایک دین پر قائم رہنے کی جگہ) جدا جدا ہو گئے اور اختلافات میں پڑ گئے باوجودیکہ روشن دلیلیں اُن کے سامنے آ چکی تھیں (یاد رکھو) یہی لوگ ہیں جن کے لئے (کامیابی و فلاح کی جگہ) بڑا (بھاری) عذاب ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶ : ۱۵۵)

اور (دیکھو) یہ میری راہ ہے بالکل سیدھی راہ پس اسی ایک راہ پر چلو، طرح طرح کی راہوں کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر جدا جدا کر دیں گی۔ یہی بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم (نافرمانی سے) بچو۔

قرآن سے بنائے نزاع

اس بات کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے مولانا آزاد اُس نزاع کی نوعیت بیان کرتے ہیں جو پیغمبر اسلام کے زمانے میں قرآن اور اُس کے اُن مخالفین میں پیدا ہو گئی تھی جو اُن دوسرے مذاہب کے پیرو تھے جو عرب میں جاری تھے۔ ان میں سے بعضوں کے پاس آسمانی صحائف بھی تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا قرآن نے اُن مقدس صحیفوں سے انکار کیا تھا؟ کیا اُس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خدا کی سچائی اُس کا ذہی واحد علمبردار ہے اس لئے تمام لوگوں کو چاہئے کہ اپنے

اپنے نبیوں سے برگشتہ ہو جائیں؟ کیا اُس نے کوئی ایسی نئی اور انوکھی بات پیش کی تھی جس کے ماننے میں قدرتی طور پر انھیں تامل تھا؟ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی۔ قرآن نے نہ صرف اُن تمام بانیانِ مذاہب کی تصدیق کی جن کے نام لیوا اُس کے سامنے تھے بلکہ صاف صاف لفظوں میں یہ کہدیا کہ مجھ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آچکے ہیں میں سب کی تصدیق کرتا ہوں۔ اُس نے کسی مذہب میں کوئی فرق و امتیاز قائم نہیں کیا اور کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کردے بلکہ اس کے برعکس یہی کہا کہ اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم یعنی ایک خدا پر ایمان اور نیک عملی کی راہ پر کاربند ہو جاؤ کیونکہ تمام مذہبوں کی اصل یہی تھی۔ اس نے نہ تو کوئی نیا اصولِ حیات پیش کیا نہ کوئی انوکھا عمل بتایا۔ اُس نے صرف انھیں باتوں پر زور دیا جو دُنیا کے تمام مذاہب کی سب سے زیادہ جانی بوجھی باتیں رہی ہیں یعنی ایمان اور عملِ صالح۔ اُس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف بلایا تو یہی کہا کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقت از سرِ نو تازہ کرلو اور ایک دوسرے کے ساتھ مِل جُل کر رہو اور ایسا کرنا ہی گویا قرآن کے پیغام کو قبول کرلینا تھا۔

پھر آخر قرآن کی مخالفت کا سبب کیا تھا؟ قریشِ مکہ کی مخالفت اس بناء پر تھی کہ اُس نے بت پرستی سے انکار کر دیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بت پرست نہیں تھے اور عیسائی کیوں برسرِ پیکار ہو گئے جنھوں نے کبھی بت پرستی کی حمایت نہیں کی تھی؟ اصل یہ ہے کہ ہر مذہب کے پیروؤں کی خواہش یہ تھی کہ قرآن اپنے حریف مذاہب کی

تعلیمات کو جھٹلائے اور چونکہ اُس نے ایسا نہیں کیا تھا اس لئے کوئی بھی اُس سے خوش نہ تھا۔ بلا شبہ یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن حضرت موسیٰؑ کی تصدیق کرتا ہے لیکن چونکہ ساتھ ہی وہ حضرت مسیحؑ کی بھی تصدیق کرتا تھا اس لئے یہودیوں نے اس کی مخالفت ضروری سمجھی عیسائی اس بات پر تو خوش تھے کہ قرآن حضرت مسیحؑ کی ماں حضرت مریمؑ کی پاکی و صداقت کا اعلان کرتا ہے لیکن وہ اس لئے ناراض تھے کہ قرآن یہ بھی کہتا تھا کہ نجات کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے نہ کہ کفارہ اور اصطباغ پر۔ عیسائیوں کے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ اسی طرح قریشِ مکّہ کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی کہ قرآن حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی بزرگی کا احترام کرتا ہے کیونکہ وہ انھیں کی نسل سے تھے لیکن وہ کیونکر برداشت کر سکتے تھے کہ اسی کے ساتھ یہودی پیغمبروں کا بھی احترام کیا جائے جو اُن کی نسل سے نہ تھے۔

مختصراً یوں سمجھنا چاہئے کہ قرآن کے تین نمایاں اُصول ایسے تھے جو اُس وقت عرب میں مُروّجہ مذاہب کے پیرووں کی ناراضی کا باعث بنے۔

پہلے تو یہ کہ قرآن مذہبی گروہ بندی کا مخالف تھا۔ اُس نے دین کی وحدت کا اعلان کیا۔ اگر اس بات کو مان لیا جاتا تو اُن کو تسلیم کرنا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصے میں نہیں آئی ہے سب کو یکساں طور پر ملی ہے لیکن اس بات کو ماننا اُن کی گروہ پرستی پر شاق گزرتا تھا۔

دوسرے یہ کہ قرآن کہتا تھا نجات و سعادت کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے، نسل، قوم، گروہ بندی اور ظاہری رسم و رواج پر نہیں ہے۔ اگر اس اصول کو وہ تسلیم کر لیتے تو پھر نجات کا دروازہ بلا امتیاز تمام نسلِ انسانی پر

کُھل جاتا لیکن اس بات کے لئے اُن میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

اور تیسرے یہ کہ قرآن اس بات پر زور دیتا تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہے یعنی کسی درمیانی واسطہ کے بغیر براہِ راست ایک خدا کی پرستش کی جائے لیکن اس وقت کے دوسرے پیروانِ مذاہب نے خدا پرستی کے نام پر کسی نہ کسی شکل میں شرک وبت پرستی کے طریقے اختیار کر لئے تھے۔ گو انھیں اس بات سے انکار نہ تھا کہ اصل دین بلا واسطہ خدا کی پرستش ہے لیکن اپنے مالوف اور موروثی طریقوں سے دستبردار ہونا انھیں شاق گزرتا تھا۔

خلاصۂ بحث

زولِ قرآن کے وقت مذہبی شعور، مختلف اقوامِ عالم کے جتھہ بندی کے شعور سے آگے نہ بڑھا تھا۔ ہر مذہبی گروہ اس بات کا مدعی تھا کہ صرف اسی کا مذہب سچا مذہب ہے اور جو آدمی اس کے مذہبی حلقہ میں داخل ہے وہی نجات کا مستحق ہے۔ صداقت کا معیار اور مذہب کی اصلِ حقیقت محض اُس کے ظاہری اعمال و رسوم تھے مثلاً عبادت کی شکل، قربانیوں کی رسوم کسی خاص قسم کے طعام کا کھانا یا نہ کھانا یا کسی خاص وضع قطع اور لباس کا اختیار کرنا یا نہ کرنا۔ چونکہ یہ ظاہری اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے اس لئے ہر مذہب کا پیرو اسی بنیاد پر دوسرے مذہبی گروہ کے پیرو کو صداقت سے خالی سمجھتا تھا ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہیں تھا کہ وہ سچائی پر ہے بلکہ یہ بھی تھا کہ دوسرے گروہ کا مذہب جھوٹا ہے اس رویہ کا قدرتی نتیجہ

یہ تھا کہ خدا کے نام پر آپس میں نفرت و خانہ جنگی اور خونریزی کا بازار گرم رہتا۔
قرآن نے دنیا کے سامنے تمام مذاہب کی عالمگیر وحدت کا اصول پیش کیا۔ اس نے کہا کہ جس طرح قوانینِ فطرت کائناتِ ہستی کے نظام کو برقرار رکھتے ہیں اسی طرح زندگی کا ایک روحانی قانون بھی ہے جو حیاتِ انسانی پر حاوی ہے اور یہ قانون سب انسانوں کے لئے یکساں ہے۔ اُس نے بتایا کہ سب سے بڑی گمراہی جس میں بنی نوعِ انسان مبتلا ہوئی یہ تھی کہ اُس نے اس قانونِ فطرت کو فراموش کر دیا اور الگ الگ گروہ بندیاں کر لیں۔ زندگی کے اس روحانی قانون یا دینِ الٰہی کا اولین مقصد یہ تھا کہ نوعِ انسانی کو متحد رکھے اور اس میں تفرقہ و نزاع نہ پیدا ہو لیکن انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اُس نے اتحاد کی اس متاعِ گراں بہا یعنی مذہب کو تفرقہ و نفاق کا ہتھیار بنا دیا۔
قرآن کے ظہور کا مقصد اصل مذہب اور اُس کے ظاہری شوائع میں امتیاز کرنا تھا۔ اصل مذہب کو اُس نے دین سے تعبیر کیا اور دوسری چیز کو شرع اور منہاج بتایا۔ دین ایک ہی ہے اور ہر زمانہ میں سب کو ایک ہی طرح سے دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف ناگزیر تھا ہر عہد اور ہر قوم کے حالات کے اعتبار سے یہ اختلافات ظاہر ہوئے پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے اور قرآن نے اسی حقیقت پر پورا زور دیا۔ قرآن کا شکوہ یہ تھا کہ دین کو فراموش کر دیا گیا ہے اور شرع و منہاج یا ظاہری شوائع کو اصل مقصد قرار دے لیا گیا ہے اور یہی چیز انسانوں کے باہمی اختلافات کی بنیاد بن گئی ہے۔
قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ اُس کی دعوت کا

مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں لیکن ان مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی یعنی خدائے واحد کی پرستش اور نیک عملی کے راستے کو پھر سے اختیار کر لیں تو قرآن کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور گو اس راستے کو اختیار کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس راہ پر چلنے والوں نے گویا قرآن کو قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی مشترکہ سچائی کو قرآن نے "الدّین" یا "الاسلام" کا نام دیا ہے۔ وہ کہتا ہے، خدا کا دین اس لئے نہیں ہے کہ انسانوں کے درمیان تفریق پیدا کی جائے بلکہ اس کے برعکس اس کا مقصد یہ تھا کہ تمام انسانوں کے درمیان باہمدگر اُخوت و رفاقت پیدا ہو اور سب ایک ہی پروردگار کے رشتۂ عبودیت سے منسلک ہو کر اُخوت کے ساتھ رہیں۔

مذہبی گروہ بندی کی لعنت آج بھی دنیا کے ہر گوشے پر مسلط ہے لیکن اس لعنت سے نجات کس طرح حاصل کی جائے؟ یہ خرابی اس لئے انسانوں میں سرایت کر گئی ہے کہ مذہب کی اصلی رُوح کو نظروں سے اوجھل رکھا گیا۔ اب یہ کام تمام مذہبی گروہوں کی پیروی کرنے والوں کا ہے کہ وہ اپنے قدموں کے کھوئے ہوئے نشانوں کا پھر سے سُراغ لگائیں اور ہر مذہب کی بنیادی تعلیم یعنی دین کے راستے پر گامزن ہو جائیں۔ اگر یہ کام کر لیا گیا تو، قرآن کہتا ہے تمام نزاعات ختم ہو جائیں گے اور ہر شخص یہ محسوس کرنے لگے گا کہ تمام مذاہب کا راستہ ایک ہی ہے یعنی وہ ایک دین جو پوری بنی نوعِ انسان کے لئے ہے اور جسے قرآن نے "الاسلام" کا نام دیا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے امن و سلامتی کا راستہ یعنی خدا پرستی اور نیک عملی یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر نوعِ انسانی

کی باہمی یگانگت کے ٹوٹے رشتوں کو جوڑا جا سکتا ہے یا اس تصور کو پھر سے زندہ کیا جا سکتا ہے کہ سب انسانوں کا ایک ہی پروردگار ہے۔ ہم سب کو ایک ہو کر اُسی کی بندگی کرنی چاہئے اور اُسی کے آگے اپنا سر جھکانا چاہئے تاکہ ہمارے تمام آپسی نزاعات ختم ہو جائیں جو ہم نے اپنے ہاتھوں پیدا کر لئے ہیں۔ قرآن کا یہی پیام تھا جو محمدؐ کے زمانے میں تمام مذاہب اور ادیان کے پیروؤں کو دیا گیا:۔

يَآاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ (۳:۵۷)

اے اہلِ کتاب! اُس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر (مسلّم) ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا (اپنا) معبود نہ بنائیں۔

جمعیتِ انسانی کو متحد کرنے کے لئے قرآن ایک وفاقی اصول پیش کرتا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی قسم کی شرع و منہاج' یا ایک ہی طرح کے ضابطہ و قانون یا ایک ہی قسم کے طریقِ عبادت کے ذریعہ تمام دنیا کے انسانوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دیا جاتا۔ اس لئے قرآن صرف اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ انسانی معیشت کو ایک ایسی بنیاد پر کھڑا کرو کہ دنیا کی مختلف اقوام' خدائے واحد کی پرستش کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ اخوت و رفاقت کے رشتے میں منسلک رہ سکیں اور ایک خاندان کے ارکان کی طرح نیک عملی کی راہ پر چل کر زندگی سے افادہ و فیضان حاصل کر سکیں' ایک حدیث میں بنی نوعِ انسان کی اسی برادری کو "ایک خدا کے کنبہ"

یا ایک ایسے گلّہ سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں ہر فرد کی حیثیت ایک دوسرے کے لئے گلہ بان کی ہوگی اور ہر ایک پورے گلّہ کی بھلائی و نگہبانی کا ذمہ دار ہوگا۔

نزولِ قرآن کو تیرہ سو سال سے زیادہ ہو چکے لیکن قرآن نے جو پیام اُس وقت دیا تھا آج بھی وہ اپنی جگہ پر قائم اور اٹل ہے۔

مطبوعاتِ انسٹیٹوٹ

انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز

	قیمت
(۱) اساسِ تہذیب (عربی، اردو) از ڈاکٹر سید عبداللطیف	چار روپیہ پچاس پیسے
(۲) گیتا اور قرآن (انگریزی) از پنڈت سندر لال مترجمہ سید اسد اللہ	چھ روپیہ پچاس پیسے
(۳) تاریخِ ثقافتِ ہند (انگریزی) مرتبۂ ڈاکٹر سید عبداللطیف	پندرہ روپیہ
(۴) آج سے قبل کا ہندوستان (انگریزی) از ڈاکٹر سید محمود مترجمہ سید اسد اللہ	تین روپیہ
(۵) ایضاً (ہندی)	تین روپیہ
(۶) اسلام اور عورت (انگریزی) از ملک رام ترجمہ پروفیسر عبدالعلی	چھ روپیہ
(۷) اساسِ ثقافتِ اسلامی (انگریزی) از ڈاکٹر سید عبداللطیف	دس روپیہ
(۸) بنیادی تصوراتِ قرآن (اردو) از مولانا ابوالکلام آزاد	دو روپیہ پچاس پیسے
(۹) ثقافتِ ہند کے اجزائے ترکیبی (انگریزی) از پروفیسر ایس۔ نٹراجن	پانچ روپیہ
(۱۰) ادبِ اردو کی ابتدا۔ مکتوباتِ ڈاکٹر گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کلکتہ (انگریزی زیر طبع)	

ملنے کا پتہ:۔ انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز ۲۲-۴-۳۰ آغا پورہ حیدرآباد دکن